R.N. 2136/52

نگار

سالانہ چندہ (علاوہ مصارف رجسٹری سالنامہ)

ہندوستان — نو روپے

پاکستان — دس روپے

قیمت فی کاپی

ہندوستان — ۷۵ نئے پیسے

پاکستان — (علاوہ محصول)

تصانیف نیاز فتح پوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

من و یزداں مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک حیرت فزا کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ اخوت عامہ کے ایک رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں مذہب کی تحقیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) برزخ (۱۷) یاجوج و ماجوج (۱۸) ماروت و ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ۔ ضخامت ۲۶۲ کاغذ سفید دبیز۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے (جبر) (علاوہ محصول ڈاک)

جمالستان ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ شاہکار ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے (جبر) (علاوہ محصول ڈاک)

نگارستان حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

مکتوبات نیاز (تین حصوں میں) فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ ان ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپے (علاوہ محصول) ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشائے لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا، اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔ جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

شہاب کی سرگذشت حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان، تخیل اس کی نزاکت بیان، اس کی انشائے عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچتی ہے۔ یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

قارئین "نگار" کے لئے چند ضروری اطلاعات

۱ - "نگار" کا سالانہ چندہ اب نو روپیہ ۵۰ پیسے ہے، جس میں ۵۰ پیسے مصارف رجسٹری سالنامہ بھی شامل ہیں۔

۲ - نگار ذریعہ وی پی طلب کرنے میں آپ کو کافی نقصان ہوگا، کیونکہ جدید قواعد کی رو سے اب محصولڈاک میں جو اضافہ ہوا ہے، اس کے پیش نظر آپ کو وی پی دس روپیہ ۱۲ پیسے میں وصول ہوگا (سالانہ چندہ ۹ روپیہ ۵۰ پیسے مصارف رجسٹری و وی پی ۵۶ پیسے، فیس منی آرڈر ۱۵ پیسے) لیکن اگر آپ نے چندہ ذریعہ منی آرڈر بھیجا تو آپ کے صرف نو روپئے ۶۵ پیسے خرچ ہوں گے اور اس طرح آپ کو ۵۶ پیسے کی بچت ہو جائے گی۔

۳ - پرچہ کی تاریخ اشاعت ہر مہینے کی سات مقرر ہے۔ اس کے بعد اگر ہم کوئی پرچہ روانہ کریں تو ہمیں محصولڈاک دو نئے پیسے کی جگہ آٹھ نئے پیسے نی کا پی ادا کرنا پڑیں گے۔ اس لئے اگر آپ کو کسی ماہ کا پرچہ نہ ملے تو اس کی اطلاع ہمیں ضرور دیدیجئے، لیکن ہم اسے دوبارہ روانہ کریں گے آیندہ ماہ کے پرچہ کے ساتھ لیکن اگر آپ اسے فوراً حاصل کرنا چاہیں گے تو ہم اسے بیرنگ روانہ کریں گے اسکے لئے آپ کو ۱۶ پیسے ادا کرنا پڑیں گے۔

۴ - خط و کتابت میں اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جو ہر مہینے پتہ کی چٹ پر بائیں طرف درج ہوتا ہے، اسے کہیں نوٹ کر لیجئے۔ زبانی یاد رکھنا مشکل ہے۔

نگار کی ایجنسیاں

تاج نیوز ایجنسی ناگپور ـــــ عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ ـــــ محمد الیاس نیوز ایجنسی کلکتہ ـــــ تجمل خاں نیوز ایجنٹ کلکتہ ـــــ
شہرت بک ڈپو احمد آباد ـــــ محمد تمیم عبدالمنان احمد آباد ـــــ حنیف بک ڈپو بمبئی ـــــ احمد علی خاں حیدرآباد ـــــ بچوں کا کتاب خانہ بمبئی۔
اپنا کتاب گھر بمبئی ـــــ ہندوستان بک ڈپو بمبئی ـــــ احمدی بک ڈپو بمبئی ـــــ کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد ـــــ
شہاب بک ڈپو امراوتی ـــــ ماڈرن نیوز ایجنسی کھنڈوا ـــــ محمد الہ بخش دربھنگہ ـــــ شمس بک ہاؤس برہان پور ـــــ
حبیب برادرس جمشید پور ـــــ آزاد کتاب گھر جمشید پور ـــــ آزاد نیوز ایجنسی بنگلور ـــــ محمد کریم بخش مظفر پور ـــــ
علمی خزانہ اسنسول ـــــ اسلامیہ بک ڈپو بھاگلپور ـــــ عبداللہ عزیزی اکولہ ـــــ فرینڈسی نیوز ایجنسی بھلواڑہ ـــــ
نواب میگزین رائے پور ـــــ آر آر راہی کرنول ـــــ سعید احمد ڈمکا ـــــ کلیم احمد جودھپور ـــــ دارالکتاب رام پور ـــــ
غیور احمد عثمان آباد ـــــ محمد شرف الدین پٹنہ ـــــ جمیل مرزا علی گڑھ ـــــ منظر امام نیوز ایجنٹ سمستی پور (دربھنگا) ـــــ
ماڈرن بک ہاؤس کانپور ـــــ سنٹرل نیوز ایجنسی کناٹ پیلس نیو دہلی۔

پاکستان کے سول ایجنٹ :- ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی ۱۰۵ - گارڈن ویسٹ - کراچی

مولانا ابوالکلام آزاد کے "ترجمان القرآن" کی دونوں جلدیں مبتیس ۳۲ روپیہ پیشگی بھیجکر آپ دفتر نگار سے حاصل کرسکتے ہیں۔ منیجر

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ اپریل میں ختم ہوگیا اور مئی کا پرچہ نو ۹ روپیہ ۵۶ پیسے میں وی پی روانہ ہوگا

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۵۷ | فہرست مضامین اپریل سنہ ۱۹۵۹ء | شمار ۴

ملاحظات ---------- ۲
غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط --- سید مبارز الدین رفعت --- ۹
نساخ اپنی خودنوشت سوانح حیات کی روشنی میں -- سید مقبول الحسن - ۱۲
فلاسفہ کا تصور الٰہ --- نواب محمد عباس طالب صفوی --- ۱۸
اقبال اور نظریۂ جمہوریت --- غلام ربانی عزیز ---- ۲۲
اشک رام پوری ---- راز یزدانی ---- ۳۱۲
مولانا آزاد ایک مفکر کی حیثیت سے --- پروفیسر رفیع اللہ عنایتی -- ۳۷
باب الاستفسار -- (پنکھڑی کا بند ورق - قبتہ الصخرا) --- ۴۱
منظومات: فیض احمد فیض - اختر سکندروی - عطا کاکوی - ارشد شاہد صدیقی - حفیظ نعیمی - اکرم دھولیوی - شارق میرٹھی شفیق مینائی - رعنا بلسوی - ام - اے حفیظ بنارسی ۴۴
مطبوعات موصولہ ---------- ۴۹

ملاحظات

سرزمین جرأت و عمل کی دلچسپ داستان

یورپ کی وہ ترقی جس پر اسے فخر و ناز تھا، اب امریکہ منتقل ہوگئی ہے اور حیاتِ انسانی کا کوئی پہلو، علم و عمل کی دنیا کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے، جس پر وہ اس وقت پیش پیش نظر نہ آتا ہو۔

یہاں کا باشندہ بعض ایسی خصوصیات اپنے اندر رکھتا ہے جو دوسرے ممالک کے بسنے والوں میں کم نظر آتی ہیں اور یہی اس کی غیر معمولی ترقی کا راز ہے۔ اس کی ایک خاص ذہنیت ہے، خاص روح ہے اور خاص سائکالوجی جو اسے دوسرے ممالک کے باشندوں سے ممتاز کرتی ہے۔

ڈاکٹر فلپ حتی نے ان کی زمانہ شناسی کا ذکر کرتے ہوئے ایک بڑی دلچسپ بات کہی ہے کہ:۔ "صرف اہلِ امریکہ ہی ایسے لوگ ہیں جو الجبرا کے ۷ - × کی طرح مختلف موقع و محل پر اپنے اندر مناسب تبدیلی پیدا کرلیتے ہیں"۔

حیات قوی ایک سیاح جب امریکہ جاتا ہے تو سب سے پہلے جو چیز اسے متحیر کردیتی ہے وہ یہاں کے لوگوں کی قوتِ حیات ہے، ان کو دیکھ کر ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ ان کا ہر فرد اپنی جگہ گویا ایک مستقل حیات ہے، ایک متحرک زندگی ہے جو کسی وقت چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔

اسٹیمر سے اتر کر جس وقت ہم نیویارک پہونچتے ہیں تو سب سے پہلے جس چیز کو دیکھ کر ہم دم بخود رہ جاتے ہیں وہ یہاں کی سربفلک عمارتوں

کا سلسلہ ہے جو حدِ نظر تک ختم نہیں ہوتا - پچاس، ساٹھ منزلوں کی عمارتیں بھی وہاں معمولی عمارتیں سمجھی جاتی ہیں، پھر اس کے بعد جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو ان کے عملی انہماک کو دیکھتے ہیں تو تسلیم کرنا پڑتا ہے یہ کتنی حوصلہ مند، بلند نظر اور صحیح الفکر قوم ہے - ان کے مشاغل زندگی اور ان کی سیماب وش حرکت و عمل سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندر کوئی خاص خون دوڑ رہا ہے جو دوسرے ممالک کے لوگوں میں نہیں پایا جاتا

خاموش حرکت دوسری چیز جو ہم کو حیرت میں ڈال دیتی ہے، ان کی خاموش حرکت ہے - تم دیکھو گے کہ سڑکوں پر، بازاروں میں، مردوں، عورتوں، جوانوں اور بڈھوں کا ایک ہجوم ہے جو اِدھر سے اُدھر دوڑتا ہوا جا رہا ہے، کوئی ہوائی ریل (سطح زمین پر بلند ستونوں پر قایم کی ہوئی ریلوے لائن) میں سوار ہونے کے لئے بھاگا جا رہا ہے، کوئی زیر زمین چلنے والی ٹرین تک پہونچنے کیلئے بیتاب ہے، کوئی ٹرامو ے میں سوار ہونے کے لئے دوڑا جا رہا ہے، کوئی موٹر بس پکڑنے کے لئے بھاگا جا رہا ہے، گویا انسانوں کا ایک سیلاب اُمنڈ رہا ہے، لیکن نہ وہاں کوئی شور و ہنگامہ ہے، نہ کوئی چیخ پکار - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مشین کے پتلے ہیں جو غیر ارادی حرکت پر مجبور ہیں -

تم اگر چاہو کہ شاہراہ پر کسی جگہ ٹھہر کر اطمینان سے ایک نگاہ ڈال لو تو ممکن نہیں، کیونکہ آدمیوں کا وہ سیلاب جو تمھارے پیچھے آرہا ہے تمھارے قدم ٹکنے نہ دے گا، اس لئے اگر تم کسی ٹرامو ے یا ریل میں سوار ہونا چاہو تو اس کی ضرورت نہیں کہ تم خود چل کر ریل یا ٹرین کے کھلے دروازے تک پہونچو، بلکہ صرف اس قدر کافی ہوگا کہ اپنے آپ کو پیچھے آنے والے ہجوم کے سپرد کر دو۔ وہ خود تمھیں ڈھکیل کر وہاں تک پہونچا دے گا -

پھرتی اسٹیمر یا کشتی سے اُتر کر جب تم پُل پر قدم رکھو گے تو سب سے پہلے یہ آواز تمھارے کان میں پڑے گی (Step Lively) "تیزی سے قدم اُٹھاؤ" اور ریل، ٹرامو ے اور موٹر بس ہر جگہ تمھیں یہی آواز سنائی دے گی ـــ پھرتی اس قوم کی غیر منفک خصوصیت ہے -

ان کا کھانا پینا، چلنا پھرنا، زندہ رہنا یہاں تک کہ مرنا اور دفن ہونا بھی اسی تیزی کے ساتھ ہوتا ہے - تم ایک درزی کی دوکان پر جاؤ گے تو سب سے پہلے تمھیں دروازہ پر یہ اعلان نظر آئے گا کہ "یہاں ہر لباس کھڑے کھڑے طیار ہوتا ہے" - اسی طرح جوتے کے کارخانہ میں بیٹھے بیٹھے تمھارا جوتا بن جائے گا - حجام کی دوکان پر پہونچتے ہی تین آدمی تمھاری طرف دوڑ پڑیں گے، ایک بال کاٹے گا، دوسرا ناخن تراشے گا اور تیسرا تمھارے جوتے صاف کرنے لگے گا - اسی طرح ہوٹلوں میں بھی "Quick Lunch" (غذاء سریع) کا انتظام ہر جگہ تمھیں نظر آئے گا - وہاں ہوٹل دو قسم کے ہیں - ایک کو Automat کہتے ہیں - یہاں کوئی ملازم موجود نہیں ہوتا - چاروں طرف چھوٹی چھوٹی بلوری الماریوں میں ہر قسم کا کھانا رکھا ہوا ملے گا جس پر قیمت درج ہوگی - تم جس چیز پسند کرو اس کی قیمت مشین کے سوراخ میں ڈال دو، دروازہ کھل جائے گا اور وہ چیز تم کو مل جائے گی، اسی طرح چاء، قہوہ، دودھ، یا پانی کے لئے الگ الگ کونوں میں نل لگے ہوئے ہیں - قیمت کا سکہ سوراخ میں ڈال دو اور پیالہ یا گلاس ٹونٹی کے نیچے رکھ دو، فوراً بھر جائے گا اور تم پیکر چلے جاؤ گے

دوسری قسم کا نام Cafateria ہے - یہاں کھانا کھلا رہتا ہے - اول اول یہ صرف طلبہ کی رعایت سے جاری کیا گیا تھا کہ ان کا وقت ضایع نہ ہو، لیکن اب اس کا رواج ریلوں میں بھی ہو گیا ہے -

اہلِ امریکہ کی اس سرعت پسندی کا مشہور لطیفہ ہے کہ وہاں ایک شخص کیوبا سے اپنی زندگی کا بیمہ کرانے آیا - بیمہ کمپنی نے اپنی سرعت، معاملہ کی صفائی اور دیانت کا اطمینان دلاتے ہوئے کہا کہ "اگر تم اس وقت کھڑکی کے باہر نیچے گر پڑو تو قبل اس کے کہ تم زمین تک پہونچو، بیمہ کا روپیہ تمھاری بیوی کے پاس پہونچ جائے گا" - اس نے کہا "اگر زمین پر گرنے کے بعد میں صحیح و سالم رہا تو ـــ" جواب ملا کہ "فوراً دوسرا تار بھیج کر روپیہ کی ادائی روک دی جائے گی"

سیر و سیاحت ـ وہاں کے لوگ سیر و سیاحت اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہنے کے اس درجہ شایق ہیں کہ اگر

وہاں کے کسی باشندہ سے اس کے حالات دریافت کرو تو معلوم ہوگا کہ اس کی پیدائش، تعلیم و تربیت، شادی اور کاروبار کا تعلق کسی ایک جگہ سے نہیں ہے - پیدا کہیں اور ہوا، تعلیم کسی دوسری جگہ پائی، شادی کسی اور شہر میں ہوئی اور کاروبار کہیں اور شروع کیا - نیویارک کی آبادی میں مشکل سے پانچ میں کوئی ایک ایسا ملے گا جو وہاں پیدا ہوا ہو۔

ریلوں کا اتنا زبردست جال وہاں پھیلا ہوا ہے کہ اگر ریل کی تمام پٹریوں کو ایک خط مستقیم میں جوڑ دیا جائے تو چاند تک دوہری پٹری ان سے طیار ہوسکتی ہے۔

شوق عمل اہلِ امریکہ کی زندگی کی بڑی خصوصیت ان کا شوقِ عمل ہے۔ چھوٹا بڑا، مرد عورت، امیر فقیر الغرض ہر شخص صبح آٹھ سے بارہ بجے تک اور پھر سہ پہر سے پانچ بجے شام تک اپنے کام میں منہمک رہتا ہے اور ان اوقات میں کسی کو ایک متنفس کو بھی بیکار وقت گزارتے ہوئے نہ دیکھ سکوگے، ان کا مقولہ ہے کہ "عرق پیشانی سے روزی حاصل کرو"۔

کسی شخص نے اڈیسن سے پوچھا کہ جینیس (Genius) کسے کہتے ہیں۔

اس نے جواب دیا کہ Genius is 99% perspiration and one % inspiration.

یعنی وہ ۹۹ فی صدی اکتسابی چیز ہے اور ایک فی صدی وہبی۔

کام میں مصروف رہنا ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ وہاں بڑے بڑے امراء کی عورتیں بھی بیکار نہیں رہتیں ان میں کوئی ڈاکٹر ہے، کوئی وکیل، کوئی معلمہ ہے اور کوئی کسی اخبار کی نامہ نگار۔ پھر یہ محنت و جانفشانی وہ اس لئے نہیں کرتیں کہ ان کا مقصود روپیہ کمانا ہے بلکہ محض اس لئے کہ دنیا میں وہ اپنے وجود کی اہمیت کو سمجھ سکیں اور وقار عزت نفس اور خود اعتمادی کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرسکیں۔ اسی لئے وہاں کے اکثر طلبہ خارج اوقات میں کام کرکے اپنے مصارف تعلیم خود پورے کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ موٹریں دھونے، کھڑکیوں کا شیشہ صاف کرنے اور مکانوں میں صفیدی کرنے سے بھی انھیں عار نہیں آتا، وہاں کام کرنا قومی کردار کا ضروری جزو بن گیا ہے۔ جب صدر ولسن اپنی خدمت سے سبکدوش ہوئے تو اس کے دوسرے ہی دن انھوں نے واشنگٹن میں تعلیم قانون کا مدرسہ جاری کردیا، حالانکہ ان کی عمر ستر سال سے متجاوز ہوچکی تھی۔

مہارتِ فن ممکن ہے ان کے ذوق سرعت پسندی کے پیش نظر کسی شخص کو یہ شبہ پیدا ہو کہ جلد بازی کی وجہ سے ان کے کام ناقص ہوتے ہوں گے، لیکن یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کیونکہ جتنی کوشش وہ ایک کام کو جلد سے جلد پورا کرنے میں صرف کرتے ہیں اتنی ہی کوشش وہ اس بات کی بھی کرتے ہیں کہ ان کا کام ہر لحاظ سے معیاری و مکمل ہو اور اسی چیز کا نام وہاں efficiency یا "مہارت" ہے - یہ بالکل جدید لفظ ہے جو ان کے لغت میں شامل ہوا ہے اور اس کی مانگ ان کے یہاں اتنی زیادہ ہے کہ کارخانوں مدرسوں، صنعت گاہوں، الغرض زندگی کے تمام شعبوں میں اسی چیز کی جستجو و تلاش ہے۔

قوتِ عمل یونتو ان کی قوتِ عمل کا ثبوت ان کی روز کی زندگی سے ہر وقت مل سکتا ہے، لیکن اس کا سب سے بڑا حیرت انگیز ثبوت انھوں نے جنگ عظیم کے زمانہ میں پیش کیا۔ اول اول جب لڑائی شروع ہوئی تو امریکہ بالکل الگ تھلگ رہا اور عرصہ تک یہی سمجھا گیا کہ وہ اس آگ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے گا، لیکن حالات کچھ ایسے پیدا ہوگئے کہ آخر کار اسے بھی اتحادیین کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرنا پڑا اور اس نے جنگ کی طیاری شروع کردی۔ لیکن جرمنی اپنی جگہ مطمئن تھا اور سب یہی سمجھتے تھے کہ جنگ ختم ہوجائے گی تب کہیں جاکر امریکہ اپنی فوج طیار کرسکے گا، لیکن دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس نے ایک سال کے اندر ہی اندر دس چھاؤنیاں قایم کرکے چالیس لاکھ فوج جدید ترین آلات حرب سے آراستہ کرلی اور دو سو نئے جہاز خاص طور پر اس لئے طیار کرلئے کہ ان کے ذریعہ سے اس فوج کو محاذ جنگ تک پہونچادے۔

اہل امریکہ کی یہ خصوصیت عجیب و غریب ہے کہ جتنی سخت مشکلات ان کے سامنے ہوتی ہیں، اتنا ہی ان کی قوت عمل میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اور اسی لئے وہ اپنے ملک کو "Land of Dare and do" (سرزمین جرأت و عمل) کہتے ہیں۔

صاف بات۔ وقت کی قدر مشرق کی خصوصیت ہے کہ جب دو شخص ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو پہلے زیادہ وقت فضول رسمی گفتگو میں ضایع کردیتے ہیں اور پھر مطلب کی گفتگو پر آتے ہیں۔ وہاں اتنی فرصت کہاں کہ چنیں چناں میں وقت ضایع کیا جائے۔ ایک مرتبہ پروفیسر فلپ کے کوئی مشرقی دوست ان سے ملنے نیویارک گئے ہوئے تھے۔ ایک دن گھر کا راستہ بھول گئے اور پولیس کے سپاہی سے مدد لینا چاہی۔ حسب عادت پہلے دعا و سلام سے کام لیا اور پھر اس کی صحت و عافیت پوچھنے لگے۔ یہ سمجھتے تھے کہ سپاہی بھی اسی اخلاق سے پیش آئے گا، لیکن اس کو یہ باتیں ناگوار ہوئیں اور اس نے جھنجھلا کر بہ آواز بلند صرف یہ کہا "What next" (یعنی مطلب کی بات کہو) ۔ اس کے خلاف مشرق میں جتنا وقت ضایع کیا جاتا ہے اس کی بھی ایک مثال سن لیجئے:۔

ایک بار ڈاکٹر وانڈیک، دمشق پہونچے تو ایک نوٹ بھنانے کسی بنک میں چلے گئے، بنک کے منیجر نے ان کو دیکھتے ہی سرد قد کھڑا ہوگیا سگار و قہوہ پیش کیا اور دیر تک ان کی صحت و عافیت پوچھتا رہا، لیکن جب اس کے بعد اصل معاملہ پیش آیا تو اس نے نوٹ بھنانے سے انکار کر دیا ۔ اگر وانڈیک، امریکہ میں ہوتے تو سگار و قہوہ سے تو بے شک محروم رہتے مگر روپیہ انھیں اسی وقت مل جاتا۔

دولت و ثروت جنگ عظیم سے قبل امریکہ کی دولت پچاس ارب ڈالر تھی، لیکن اب وہ اربوں ڈالر سے دوسرے ملکوں کی مدد کر رہا ہے اور اس وقت وہاں لاکھوں کروڑپتی ہیں، لکھ پتیوں کا کیا ذکر۔ وہاں ہر شخص میں دولت حاصل کرنے کی خواہش دیوانگی تک پہونچ گئی ہے اور روپیہ کی عزت و وقعت ان کے دل میں اتنی ہے کہ وہ ڈالر کو "Almighty" (قادر مطلق) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن وہ ڈالر سے محبت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ڈالر ہے بلکہ صرف اس لئے کہ وہ آیندہ ترقی کرنے کا سبب ہے اور اس سے قومی عزت و ثروت میں اضافہ ہوتا ہے۔

تفاؤل پسندی اہل امریکہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر کام کا روشن پہلو ان کے سامنے ہوتا ہے اور ناکامی و مایوسی کا خیال بھی ان کے دل میں نہیں آتا۔ اس کا سینہ امیدوں سے لبریز ہوتا ہے اور یاس و ناامیدی کو پاس نہیں آنے دیتا۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اس یقین کے ساتھ کرتا ہے کہ وہ ضرور اس میں کامیاب ہوگا اور جب تک کامیابی حاصل نہ ہو وہ برابر سعی و کوشش کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ امریکہ کا ہر انسان اپنے مستقبل کو بہت روشن و درخشاں دیکھتا ہے اور مصائب و مشکلات کے سامنے سر پکڑ کر نہیں بیٹھ جاتا۔ اس دنیا کے متعلق اس کا مقولہ ہے کہ:۔

After all this world is not bad to live in.

(جو کچھ بھی ہو یہ دنیا زندگی بسر کرنے کے لئے بری نہیں)

مشرقی افق سے بادل کا کوئی ٹکڑا نظر آجائے تو وہاں ہر شخص کی زبان سے یہی فقرہ تم کو سننے میں آئے گا:۔

"What a beautiful day." (کتنا اچھا دن ہے)

وہاں کے لوگ جب تعزیت کے لئے جاتے ہیں تو ان کے الفاظ تسلی صرف یہ ہوتے ہیں کہ "مرنے والا کتنا حسین و دلچسپ انسان تھا" گویا ان کے نزدیک قابل اعتنا صرف اس کی خوبصورتی و دلچسپی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دنیا کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں اور کتنا پرامید دل اپنے سینہ میں رکھتے ہیں۔

خوش مزاجی خوش رہنا اور دوسروں کو خوش رکھنا ان کی فطرت ثانیہ ہے۔ وہ دنیا کو سب سے بڑی نشاط گاہ سمجھتے ہیں اور انسانی زندگی کو ایک قہقہۂ طویل۔ اسی لئے ہر زمانہ میں وہاں کوئی نہ کوئی مضحک فرد پایا گیا ہے جس نے اپنے

مضحک انداز بیان کے لحاظ سے خاص شہرت حاصل کی۔

وہ ہر وقت ہنسنے اور ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ ذوق ان کی قومی خصوصیت بن گیا ہے۔ ایک بار مارک ٹوین (مشہور امریکی مزاح نگار) یورپ کا سفر کر رہا تھا کہ امریکہ کے بعض اخبارات میں اس کی وفات کی خبر شایع ہوگئی۔ جب اسے معلوم ہوا تو اس نے ان اخباروں کو تار دیا کہ "میری موت کی خبر میں بہت مبالغہ سے کام لیا گیا ہے"۔

حیات انفرادی و ہیئت اجتماعی

انسان کی فطرت ہے کہ جب اس کی قوت بڑھ جاتی ہے تو اس میں سرکشی و تمرد کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں اور ابناء جنس کے ساتھ اس کی ہمدردی کم ہو جاتی ہے لیکن اہل امریکہ کا یہ حال ہے کہ باوجود اتنی غیر معمولی قوت و دولت رکھنے کے ان میں تعاون و ہمدردی کی کیفیت زایل نہیں ہوئی بلکہ اس میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔

انفرادی حیثیت سے آزادی کا یہ عالم ہے کہ وہاں ہر شخص اپنے آپ کو ایک مستقل عضو تمدن کا سمجھتا ہے اور اس کے والدین بھی اس کو کسی امر پر مجبور نہیں کر سکتے، لیکن اسی کے ساتھ وہاں کا اجتماعی احساس اتنا زبردست ہے کہ وہاں کا صدر بھی بغیر مشورہ کے اپنے اختیار سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔

فرض شناسی اور ابداع و ذہانت

اہل امریکہ کی ایک اور خصوصیت جو مشرقی ممالک میں بہت کم نظر آتی ہے، ان کی فرض شناسی ہے، اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ قانون کی پابندی کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں بلکہ خود ان کے اندر ذاتی احساس اس امر کا پایا جاتا ہے کہ ایک متمدن انسان ہونے کی حیثیت سے جو فرائض ان پر عاید ہوتے ہیں ان سے سرمو تفاوت نہ کریں اس کی نمایاں مثال یہ ہے کہ بڑے بڑے ہجوم میں بھی وہ نظم و ترتیب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ وہ کسی کو ڈھکیل کر آگے نہیں بڑھتے بلکہ باقاعدہ صف بنا کر آگے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کو انتہائی بدتمیزی سمجھا جاتا ہے کہ اپنی جگہ چھوڑ کر کسی دوسرے شخص کی جگہ پر قبضہ کیا جائے۔ الغرض نظم و ترتیب کا احساس ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے اور وہاں تمام کام خاص ترتیب و سلیقہ سے ہوتے ہیں۔ ایک گوشت فراہم کرنے والے کارخانہ کا حال پروفیسر ٹلپ اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ دروازہ کے اندر داخل ہوتے ہی پہلے آپ کو ایک آدمی نظر آتا ہے جو ہاتھ میں بڑا زبردست ڈنڈا لئے ہوئے ہے، جب جانور (ایک حرکت کرنے والے تختہ پر) اس کے سامنے سے گزرتا ہے تو وہ ڈنڈا مار کر اسے بیہوش کر دیتا ہے، پھر وہ دوسرے آدمی کے سامنے سے گزرتا ہے جو اس کی شہ رگ نیزہ سے کاٹ دیتا ہے، تیسرا آدمی کوچیں کاٹ دیتا ہے، چوتھا کھال اُدھیڑنے کی ابتدا کرتا ہے، یہاں تک کہ اس متحرک تختہ پر پڑے پڑے جانور کی کھال، چربی، بال، دانت، سینگ، گوشت وغیرہ سب چیزیں الگ الگ ہو جاتی ہیں اور دباغت و صفائی کے بعد ڈبوں یا بنڈلوں میں بند ہو کر گاہک کے سامنے آجاتی ہیں۔

ایجاد و اختراع بھی ان کی طبعی خصوصیت ہے۔ وہ ہر چیز کو اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس سے کوئی نہ کوئی علمی یا تجارتی نتیجہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دن کولیر کمپنی کے منیجر نے ہارورڈ یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر الیٹ کی تقریر اخبار میں دیکھی کہ دنیا کا بہترین لٹریچر ایک پانچ فٹ کی الماری میں سما سکتا ہے۔ اس نے فوراً شرکاء کمپنی کو طلب کر کے شام تک فیصلہ کر لیا اور دوسری صبح کو امریکہ کے تمام اخباروں میں یہ اشتہار درج تھا کہ:۔ "ڈاکٹر الیٹ کی پانچ فٹ کی الماری جس میں تاریخ، مذہب، فلسفہ و ادب کی بہترین کتابیں پائی جاتی ہیں صرف کولیر کمپنی سے مل سکتی ہیں"۔ اور چند دن میں اس کمپنی نے لاکھوں ڈالر کمائے۔

فرض کیجئے کہ وہاں کوئی بازیگر آہنی گولوں کا تماشہ کر رہا ہے اور اسے پولٹزر، اگلی، بلاسکو، اڈیسن اور راکفلر قسم کے لوگ بھی دیکھ رہے ہیں تو وہ دوسرے تماشائیوں کے ساتھ قہقہہ و مسرت میں تو شریک رہیں گے لیکن ساتھ ہی ساتھ پولٹزر یہ سوچے گا کہ اخبار میں اس فن پر افتتاحیہ کیونکر لکھا جائے، اگلی سوچے گا کہ ایسے تفریحی مجمعوں میں Charity کو کیونکر مقبول بنایا جائے بلاسکو غور کرے گا کہ بازیگر کو کسی افسانہ کا کیونکر ہیرو بنایا جا سکتا ہے، اڈیسن سوچے گا کہ ایسے مجمع کے لئے کہربائی روشنی اور ہوا کے انتظام

کے لئے کون سا آلہ ایجاد کرے، اور راکفلر بنزین گیس کی قیمت بڑھانے کی تدابیر سوچے گا، کیونکہ مجمع میں لوگوں کو مطمئن و خوشحال دیکھا تھا

وہاں عید میلاد میں بڑی خوشی منائی جاتی ہے اور احباب واعزہ میں باہم تحایف کا تبادلہ ہوتا ہے۔ ایک غریب بڑھئی مسٹر جیمس پریشان تھا کہ وہ اپنے بچوں کو کیا تحفہ دے۔ اس نے غور کرکے ایک گھوڑا لکڑی کا بنایا جو پہیوں پر چلتا تھا اور ایک لڑکا آسانی سے اسے چلا سکتا تھا۔ جب ۲۵ر دسمبر کو محلہ کے تمام لڑکے اپنے اپنے تحائف لیکر نکلے تو جیمس کے بچے سب میں ممتاز تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاروں طرف سے اس چوبی گھوڑے کی مانگ شروع ہوگئی اور وہ امیر ہوگیا۔

دورانِ جنگ میں جب کپڑے کی قیمت بہت بڑھ گئی تو ایک طالب علم نے اپنی ماں سے کہا کہ "تم مجھے کینوس کی عبا (over all) بنا دو"۔ اس کی ماں فن خیاطی کی ماہر تھی اس نے نہایت خوشنما عبا طیار کردی اور اس کو پہن کر مدرسہ گیا۔ لوگ اس کو دیکھ کر پھڑک گئے اور اس تراش کی عبا نے اتنی مقبولیت حاصل کرلی کہ چند دنوں میں وہاں کثرت سے over all clubs قایم ہوگئے۔ یہ حال ہے وہاں کے معمولی معمولی لوگوں کا اور اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہاں کا اہل علم طبقہ کیا کچھ نہ کر رہا ہوگا۔

اقدام عمل امریکہ کسی وقت تارک الخمر ہوگیا تھا، لیکن یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس کی تحریک ایک خاتون کی طرف سے ہوئی تھی اس کی عمر سو سال کی تھی اور وہ شراب کے نقصانات سے پوری طرح واقف تھی۔ یہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے سب سے پہلے اپنے شہر میں ایک مختصر سی جماعت ایسی پیدا کرلی جس نے شراب نہ پینے کا عہد کیا اس کے بعد دوسرے شہر میں یہ خیال پیدا ہوا اس کے بعد تیسرے اور چوتھے میں یہاں تک کہ لوگوں کو شراب سے نفرت ہوگئی اور تمام اخبارات نے شراب نوشی کی مخالفت شروع کردی، یہاں تک کہ حکومت کو قانوناً اسے جرم قرار دینا پڑا۔

امریکہ میں ادبی، اجتماعی و رفاہی انجمنیں بہ کثرت قایم ہیں اور ان میں سے ہر ایک عملی حیثیت سے نظام حکومت کا ساتھ دیتی ہے مثلاً کسی شہر میں وہاں پچاس شفاخانے حکومت کی طرف سے قایم ہیں تو اس سے دوچند شفاخانے رفاہ عام کی انجمنوں کے قایم کئے ہوئے نظر آئیں گے۔ چنانچہ انڈریو کارنگی نے کروروں ڈالر امریکہ کی ترقی پر صرف کردئے اور راکفلر نے بے اندازہ دولت اس کوشش میں صرف کردی کہ امریکہ میں وہ بخار نہ پھیلنے پائے جو پناما کے قرب وجوار میں ہزاروں انسانوں کی جان لے لیتا ہے۔

تعاون واشتراک عمل اہل امریکہ انفرادی منفعت کے قایل نہیں، وہ ہر بات کو تعاون و اشتراک عمل کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص وہاں اپنی انفرادی کوشش و ذہانت سے کوئی اختراع کرتا ہے تو وہ اس سے تنہا فایدہ اٹھانا پسند نہیں کرتا۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ امراو ملک تک وہ اس فایدہ کو پہونچانا چاہتا ہے۔ وہ یہ کبھی سوچ ہی نہیں سکتا کہ ایک شخص انفرادی حیثیت سے بھی کوئی اہمیت رکھ سکتا ہے۔ وہاں فرد نام ہے کسی جماعت کے عضو کا اور جماعت نام ہے متعدد افراد کی متفقہ کوشش ومحنت کا Co-operation وہاں کی قانون حیات کا بالکل جدید لفظ، لیکن چونکہ یہ ترقی کی اہم ترین راز ہے اس لئے اب اہل امریکہ بغیر اس کے کسی کاروبار کا تصور ہی نہیں کرسکتے، اور وہاں کے تمام صحائف و جرائد میں اسی لفظ کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔

وہاں جذبۂ تعاون اتنا وسیع ہے کہ اگر کوئی شخص وہاں شاہراہ عام پر کھڑا ہوکر اپنی کوئی تجویز پیش کرتا ہے تو ہزاروں آدمی اس وقت اس کی مدد کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں، حتیٰ کہ تجویز، تدبیر عمل ونتیجہ کے تمام مراحل ایک ساعت کے اندر طے ہوجاتے ہیں۔

وہاں عورتوں، لڑکیوں، شاعروں، ادیبوں، اخبار نویسوں، تاجروں، اندھوں، یتیموں، الغرض تمام جماعتوں کی کثیر انجمنیں قایم ہیں، جن کا مقصود محض انباء جنس کی خدمت ہے اور اگر آپ ان انجمنوں کی تاریخ معلوم کرنا چاہیں گے تو پتہ چلے گا کہ وہ صرف ایک آدمی کی آواز پر وجود میں آئی تھیں

شرق وغرب کا فرق مشرق کا انسان جب جنت کا تصور کرتا ہے تو اسے ایک خوش منظر باغ نظر آتی ہے، جہاں لوگ آرام سے لیٹے ہوئے ہیں، امن وسکون کی بے فکر زندگی گزار رہے ہیں، چنانچہ بہشت کی آسایش ونعمت کا

تصور ہمارے شعراء نے یہی کیا ہے کہ "کسے را با کسے کارے نباشد"۔ مختصر یہ کہ کچھ نہ کرنا اور بیکار وقت گزارنا انتہائی نعمت و مسرت کی بات ہے۔ برخلاف اس کے امریکہ انسان فردوس کا تصور عمل و حرکت کو سامنے رکھ کر کرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ وہاں ایجاد و اختراع کا بازار گرم ہوگا، لوگ اپنے اپنے کاموں میں منہمک ہوں گے۔ علم و حکومت کی ترقی ہو رہی ہوگی، مشینیں چل رہی ہوں گی، ایجادیں ہو رہی ہوں گی صنعت و حرفت بڑھ رہی ہوگی، تجارت کی گرم بازاری ہوگی، ہر شخص اپنی قوتِ بازو سے روزی کماتا ہوگا اور جب انبار جنس کی خدمت کا سوال سامنے آتا ہوگا تو وہ ہر مدد کے لئے طیار ہو جاتا ہوگا۔

جس وقت امریکہ کا باشندہ برد کلین اور نیویارک کے درمیان ساحل بحر پر کھڑا ہوتا ہے تو وہ غور کرتا ہے کہ کس تدبیر سے یہاں پل قایم ہو سکتا ہے کہ لوگ آسانی سے یہاں وہاں جا سکیں، لیکن مشرق کا باشندہ یہاں کھڑے ہو کر صرف ایک نظم کر سکتا ہے۔ اسی طرح آبشار نیاگرا کو دیکھ کر وہاں کا باشندہ صرف یہ سوچتا ہے کہ اس سے بجلی کی قوت زیادہ سے زیادہ کیونکر پیدا کی جا سکتی ہے لیکن ایک مشرقی باشندہ یہاں صرف گنگنا سکتا ہے۔

محرکات ترقی اہل امریکہ کے محرکات عمل و اسباب ترقی پر غور کیا جاتا ہے تو تین بنیادی سبب ہمارے سامنے آتے ہیں:۔

(۱) تاریخی - (۲) جغرافی - (۳) نفسیاتی۔

محرک تاریخی یہ تھا کہ ۱۴۹۲ء میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا لیکن ہالینڈ کے بعض مستعمرات کے سوا سارا ملک سترھویں صدی تک خالی پڑا رہا۔ ۱۶۲۰ء میں سب سے پہلے انگلستان کے لوگوں نے ہجرت شروع کی اور اپنا ملک و وطن چھوڑ کر اس دور و دراز بحر زمین میں قسمت آزمائی کے لئے پہونچے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے یہ جرأت کی ہوگی وہ بڑے عزم و ثبات کے لوگ رہے ہوں گے، اس کے بعد فرانس، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے لوگ یہاں پہونچے۔ اس زمانہ میں سمندر کا سفر سخت خطرناک تھا صرف وہی لوگ اس کی جرأت کر سکتے تھے جو غیر معمولی قوت عمل و صحت جسمانی کے مالک ہوں اس لئے ظاہر ہے کہ ان کے میل جول سے جو نسل بڑھی ہوگی وہ بھی ویسی ہی باہمت ہوگی اور اس طرح یہاں کی آبادی نہایت منتخب افراد کی آبادی بن گئی اور ترقی کا سلسلہ چل پڑا۔

محرک جغرافی یہ تھا کہ یہاں کی زمین کاشت کے لئے بہت مناسب تھی اور یہاں معدنیں بھی کافی پائی جاتی تھیں۔ نئی زمین تھی اور نئے عزم و ولولہ کے انسان۔ اس لئے زمین سونا اگلنے لگی اور معدنوں نے اپنی دولت ان کے سامنے پیش کر دی۔ پھر اسی کے ساتھ ایک بات یہ بھی تھی کہ یہاں کی آب و ہوا بڑی خوشگوار تھی۔ نہ گرمی اتنی تھی کہ قوائے انسانی مضمحل ہو جاتے اور نہ اتنی سردی کہ انسان ٹھٹھر کر رہ جاتے۔ یہاں کے معتدل موسم سے ان لوگوں نے پورا فایدہ اٹھایا اور رات دن کام میں لگے رہے۔

اب محرک نفسیاتی کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں کی ترقی میں اس تحریک کا کتنا بڑا ہاتھ ہے کہ گھر کے اندر ماں باپ، مدرسہ میں اساتذہ، اخبارات میں اڈیٹر سب کے سب نے ہمیشہ یہی درس دیا کہ زندگی نام ہے صرف عمل و اجتہاد کا، ہر وقت آگے بڑھتے رہنے کا، اور کسی ایک نقطہ پر پہونچ کر قناعت کر لینے کا

رعایتی اعلان

من و یزداں — مذہبی استفسارات و جوابات — نگارستان — جمالستان — مکتوبات نیاز تین حصے — مالہ و ماعلیہ — حسن کی شہاریاں

مذہب — مجموعہ استفسار و جواب جلد سوم — قول فیصل — شہاب کی سرگزشت — نقاب اٹھ جانے کے بعد — فراست الید —

میزان :

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر مع محصول صرف چالیس روپے میں مل سکتی ہیں۔ منیجر نگار لکھنؤ

غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط

(حبیب اللہ ذکا کے نام)

سید مبارز الدین رفعت

نواب عنایت جنگ بہادر حیدر آباد کے مشہور صاحب ذوق اور علم دوست رئیس ہیں۔ اُردو فارسی ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں اور ہندوستان کی تاریخ پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ آپ کے کتب خانے میں بہت سی نادر کتابیں، فرامین، دستاویزیں اور خطوط موجود ہیں۔ ایک بار آپنے حیدر آباد کے ایک پرانی کتابوں کے تاجر سے بڑی بھاری رقم دے کر دیوان صائب کا ایک ایسا قلمی نسخہ خریدا تھا جو مرزا صائب کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، اور اس کے حاشیے پر صائب نے اپنے قلم سے کچھ حک و اضافہ کیا تھا۔ دیوان صائب کا یہ نسخہ آپ نے اپنے دوست مرزا حسین علی خاں مرحوم صدر شعبۂ انگریزی جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد کے نذر کر دیا۔ اور اب یہ نسخہ ان ہی کے کتب خانہ کی زینت بنا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صائب کا یہ دیوان غالب کے نادیدہ دوست اور شاگرد منشی حبیب اللہ ذکا کی ملک رہ چکا ہے کیونکہ اسی کتاب کے اندر سے منشی صاحب کے نام غالب کا لکھا ہوا ایک خط برآمد ہوا جو اب تک غیر مطبوع ہے۔ نواب صاحب نے غالب کا یہ خط سنٹرل اسٹیٹ لائبریری حیدر آباد دکن میں محفوظ کرا دیا ہے۔ غالب کے اس خط کے ساتھ نواب عنایت جنگ نے ایک خط ڈاکٹر راحت اللہ خاں کیوریٹر اسٹیٹ لائبریری کو لکھا تھا جس میں بعض باتوں کی تصریح تھی وہ خط یہ تھا:-

یہ خط حبیب اللہ ذکا نایطی کے نام ہے۔ ضلع نلور مدراس کے رہنے والے حافظ محمد میران کے فرزند تھے۔ ۱۲۷۳ھ میں حیدر آباد آئے۔ مختار الملک نے منشی گری پر تقرر کیا اور دوم تعلقدار ہوئے۔ ۱۲۹۷ھ میں انتقال ہوا۔ ان کی تصانیف خاش وخماش میرے ہاں موجود ہے۔ اچھے ادیب و شاعر تھے۔ ۱۳۴۱ھ میں بتوسط مرزا محمد تقی صاحب تقی جو سید علی شوستری کے شاگردوں میں سے تھے، چند کتابیں میں نے خریدی تھیں۔ منجملہ ان کے ایک دیوان صائب بخط صائب (کذا فی الاصل) تھا جس کے حاشیہ پر بعض جگہ صائب نے کچھ اضافہ اور کمی بھی کی ہے۔ یہ دیوان میں نے پروفیسر مرزا حسین علی خاں صاحب کو دیدیا۔

اس خط میں جس قصیدے کا ذکر کیا گیا ہے وہ کونسا قصیدہ ہے؟ غالب نے اس میں مرجع کا لفظ استعمال کیا ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ سرکار کی شان میں ہے۔ دار الانشاء کا ذکر ہے۔ دار الانشاء کا تعلق ذات شاہی سے تھا۔ کہیں مطبوعہ نسخہ مل جائے تو پتہ چلے گا۔ میرے والد مرحوم کے ملنے والوں سے تھے۔ اکثر بضمن تذکرۂ میر انیس ان کا بھی ذکر فرمایا کرتے تھے۔ ۷ رجب ۱۳۴۳ھ کا میرا پنسل سے نوٹ تھا، نقل کو کے غالب کے خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ عنایت جنگ - ۱۲ اپریل ۱۹۵۵ء

(خط غالب)

صبح شنبہ - ۱۲ رجمادی الثانی - سال غفر ۱۲

بندہ پرور! پرسوں مولوی صاحب کا خط آیا۔ باکتب فیہ بسبیل نقل یہ ... (جگہ چھوڑ دی ہے) آج مسودہ عرضداشت کا جو آپ نے مجھ کو بھیجا تھا پیش گاہ آفاقی نامدار گزرانا اور اپنے نام کے خط کا بھی پیش کرنا مناسب جانا۔ بعد ملاحظہ کے یوں ارشاد ہوا کہ قصیدہ اور عرضداشت کی

تفتیش اور تلاش کی جاوے جو دارالانشاء میں ملی تو جواب لکھا جاوے - یقین ہے کہ بعد گرد آوری کاغذات کے اگر عرض داشت مل گئی یا قصیدہ نکل گیا تو جواب ملے گا ۱۲

اب میں بقول صائب ؎

در ماندۂ کار خودم حیران اطوار خودم ہر لحظہ دارد نیستی چوں قرعۂ رمّال ہا

یوں سمجھا ہوا تھا کہ نوؔ لفافے جو علی التواتر یکے بعد دیگرے ارسال ہوئے ہیں، متواتر دارالانشاء میں پہونچے اور منشی نے چاک کر کے پھینک دئے ہوں۔ تاکہ یوں ہی ہوا - بشرط التفات مولانا میرا مطلب اس صورت میں بھی فوت نہیں ہوتا یعنی مولوی صاحب کہہ سکتے ہیں کہ جو نذر اس کی میری معرفت گزری ہے اس کے قبول ہونے کی عرضِ اطلاع میں وہی لکھا جائے جو قصیدہ و عرض داشت کے گزرانے کے بعد لکھا جاتا - مولوی موید الدین صاحب جو حضرت کے مقرب اور اوس حضرت میں میرے مقرب ہیں، یہ کلمۂ موجز کہہ سکتے ہیں - مگر میں اون سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا وہ نوؔ کاغذ دفتر سے نکل کر پیش ہوئے یا نہیں ۱۲

آگے اس سے جس دن دیوان کا پارسل اور خط مولانا کو بھیجا ہے، اوس کے دوسرے دن ایک پارسل اور ایک خط آپ کو میں نے بھیجا ہے آجتک اوس پارسل کی رسید میں نے نہیں پائی - سخت مشوش ہوں - اگر وہ پارسل پہونچ گیا ہے تو اس کی رسید لکھئے اور اگر نہیں پہونچا تو وہاں کے ڈاک گھر میں دریافت کیجئے اور میرے اس خط کا جواب لکھئے

نجات کا طالب غالب ۱۲ -

ہاں، خوب یاد آیا - وہ قصیدہ بھی اس کلیات میں مطبوع ہو گیا ہے، صفحہ ۳۴۶، سطر ۱۲ - دفتر سے قصیدے کا کاغذ نکلنے کی صورت میں بھی قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزر سکتا ہے -

وسلام مع الاکرام

اس خط کے سلسلہ میں بعض باتیں تشریح طلب ہیں - حبیب اللہ ذکا، غالب کے نادیدہ عقیدت مند اور شاگرد تھے - ان کے حالات کے لئے تاریخ نویط مولفہ نواب عزیز جنگ کے سوا اور بھی متعدد کتابیں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں - مثلاً محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن جلد اول، مصنفہ عبدالجبار خاں ملکاپوری، تذکرہ گلزار اعظم، مصنفہ نواب محمد غوث خاں اعظم، تزک محبوبیہ، مصنفہ غلام سمدانی گوہر - ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ منشی حبیب اللہ ذکا نیلور کے باشندے تھے - ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی منشی رحمت اللہ رسا سے حاصل کی جو راجہ کمٹ گری کے دیوان تھے - پھر مدراس جا کر عربی اور فارسی کی متداولہ کتابیں پڑھیں - شعر و ادب کی محفلوں میں بڑا نام پیدا کیا - اردو، فارسی دونوں کے شاعر و ادیب تھے - مدراس کے علمی حلقوں میں بے مثل منشی سمجھے جاتے تھے - پہلے اپنے کلام پر مدراس کے دو عالم بھائیوں یعنی ثاقب اور بینش سے اصلاح لیتے تھے - پھر غالب سے شیفتگی اور دیوانگی کی حد تک غائبانہ عقیدت پیدا کر لی - اس خیال سے کہ ممکن ہے حیدرآباد پہونچ کر کوئی صورت غالب سے ملنے کی نکل آئے گی اپنے گھر والوں کو خبر کئے بغیر گھر سے نکلے اور پیدل سفر کی صعوبتیں سہتے ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵-۵۶ء میں حیدرآباد پہونچ گئے -

حیدرآباد میں ایک صاحب مولوی عبدالوہاب سے ان کی جان پہچان تھی - وہ نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول کی ڈیوڑھی میں میز خانے کے مہتمم تھے - ان کی اور سید محمد عباسی صاحب کی سعی و کوشش سے ذکا، سالار جنگ اول کی سرکار میں پہونچے اور صدر محاسبی میں میر منشی مقرر ہو گئے - بعد میں نواب صاحب کی جاگیر میں ایک اچھی خدمت انھیں ملی - وفات سے پہلے ناگر کرنول میں تعلقہ دار تھے - ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۵ء میں (۴۷) برس کی عمر پا کر فالج سے انتقال کیا اور حیدرآباد کے مشرقی محلہ چنچل گوڑہ میں دفن ہوئے -

ذکا کے فارسی کلام کو ان کے بیٹے محمد میراں سبحانی نے مرتب کر کے "قاش و قماش" کے نام سے ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۹ء میں شایع کیا تھا - اس پر مختصر تقریظ غالب نے لکھی تھی جو مجموعہ کے شروع میں درج ہے اور اردوئے معلیٰ میں بھی شامل ہے - اردو کلام بھی انھوں نے مرتب کیا تھا، اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی -

حیدر آباد پہونچنے کے بعد مرزا غالب سے مکاتبت کا سلسلہ شروع ہوا اور ذکا ان سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ غالب کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد ذکا نے اپنا پہلا کلام ضایع کر دیا۔ اپنے خط میں استاد سے ایسی گہری عقیدت اور نیازمندی کا اظہار کرتے تھے کہ استاد کو بھی ان سے محبت ہوگئی اور وہ ذکا سے بڑی شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ذکا ان کی خدمت میں اپنی غزلیں اور نثر کے مسودے بھیجتے رہتے تھے اور وہ پیرانہ سالی کے باوجود ان کی اصلاح سے دریغ نہ کرتے تھے۔ ابتدائی خطوط میں ذکا کے پوچھنے پر اپنا اور اپنے خاندان کا مختصر حال بھی انھیں لکھ بھیجا تھا جب بے تکلفی اور بڑھی تو انھیں کبھی مولانا، کبھی بندہ پرور، کبھی محبوب، کبھی مشفق، کبھی جان غالب اور کبھی جاناں لکھنے لگے۔ ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں:-

"بھائی، میں نہیں جانتا کہ تم کو مجھ سے اتنی ارادت اور مجھ کو تم سے اتنی محبت کیوں ہے۔ ظاہرا معاملہ عالم ارواح کا ہے۔ اسباب ظاہری کو اس میں دخل نہیں۔ تمھارے خط کا جواب مع اوراق مسودہ روانہ ہو چکا ہے۔ وقت پر پہونچے گا۔ سترا بہترا اردو میں ترجمہ پیر حرف ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے۔ پس میں اخرف ہوں ۔۔۔۔۔۔"

ایک اور خط میں انھیں لکھتے ہیں:-

"میرے شفیق، میرے مشفق، مجھ ہیچ پوچ کو ماننے والے، مجھ سے بُرے کو اچھا جاننے والے، میرے محب، میرے محبوب، تم کو میری خبر بھی ہے، آگے ناتواں تھا، اب نیم جاں ہوں، آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوں ۔۔۔۔"

عود ہندی میں ذکا کے نام مرزا کا کوئی خط نہیں۔ اردوئے معلی کا جو اڈیشن شیخ مبارک علی (لاہور) نے ۱۹۲۶ء میں چھاپا تھا، اس کے پہلے حصہ میں ذکا کے نام مرزا کے نو خط ہیں اور دوسرے حصہ میں چار۔ خطوط غالب مرتبۂ مولانا غلام رسول مہر میں ان کے نام (۱۵) خط ہیں۔ پہلا خط ۱۳ر صفر ۱۲۸۰ھ م ۳۰ر جولائی ۱۸۶۳ء کا ہے اور آخری خط ۲ر شوال ۱۲۸۴ھ م ۲۷ر جنوری ۱۸۶۸ء کا۔

ذکا کے نام غالب نے اپنے پہلے خط میں سنہ اسی طرح لکھا ہے "۱۳ر صفر سال غفر"، غالباً صفر کا قافیہ غفر انھیں خوب مل گیا تھا۔ اعداد ابجد کی رو سے یہ ۱۲۸۰ھ کا سال ہے۔ پھر موجودہ مکتوب جمادی الثانی میں لکھا تو وہی سال غفر لکھدیا۔ سرسید علیہ الرحمہ کی وفات کی مشہور تاریخ کسی نے "غفرلہ" سے نکالی تھی۔ ممکن ہے غالب کے اسی "سال غفر" سے "غفرلہ" کی طرف ذہن منتقل ہوا ہو۔ موجودہ مکتوب میں "سال غفر" کے بعد ۱۲ کا ہندسہ "حد" کے لئے آیا ہے۔

خط میں ایک قصیدے کا بار بار ذکر آیا ہے۔ نواب عنایت جنگ بہادر کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ قصیدہ حضور نظام کی مدح میں لکھا گیا ہوگا۔ غالب نے یہ قصیدہ ریاست حیدر آباد کے نامور وزیر اعظم نواب میر تراب علی خاں مختار الملک سر سالار جنگ اول (۱۸۲۹ء - ۱۸۸۳ء) کی مدح میں لکھا تھا۔ اور بار بار اس سلسلہ میں یاد دہانی بھی کی۔ لیکن بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر شنوائی نہیں ہوئی اور وہ صلہ سے محروم ہی رہے۔ غالب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ قصیدہ مدت ہوئی نواب سالار جنگ کے دفتر سے برآمد ہو چکا ہے۔ یہی قصیدہ، جیسا کہ غالب نے لکھا ہے ان کے کلیات فارسی میں شایع ہو گیا ہے۔ کلیات کا پہلا اڈیشن میری دسترس سے باہر تھا۔ میں نے اس سلسلہ میں مخدوم محترم مولانا امتیاز علی عرشی کو زحمت دی تھی۔ میری رہنمائی فرماتے ہوئے ان مخدوم نے مجھے لکھا

"غالب کے جس خط کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس میں اس قصیدہ کا حوالہ ہے جو نواب مختار الملک کی مدح میں لکھا گیا تھا۔ اس کا مطلع ہے:-

در مدح سخن چرا نگویم　　شرطست کہ داستاں نگویم

اسکے اشعار کی تعداد (۶۳) ہے اور یہ غالب کے فارسی دیوان کے اس اڈیشن میں پہلی بار شایع ہوا تھا جو ۱۲۷۹ھ (مطابق ۱۸۶۳ء) میں منشی نولکشور نے چھاپا تھا۔

غالب کے خط میں مولوی موید الدین کا بھی ذکر آیا ہے۔ ان کے بارے میں خود غالب، ذکا کے نام ۱۰ر ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ (م ۲۵ر ستمبر ۱۸۶۳ء) کے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"موید الدین خاں صاحب کے بزرگوں میں اور فقیر کے بزرگوں میں باہم وہ خلت و صفوت مرعی تھی کہ وہ مقتضی اس کی ہوئی کہ ہم میں اور ان میں برادرانہ ارتباط و اختلاط باہم رہے اور ہمیشہ یونہی بلکہ روز افزوں رہے گا۔ خط میں خط ملفوف کرنا جانب حکام سے ممنوع ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو میں ان کے نام کا خط تمھارے خط میں ملفوف کر کے بھیجتا۔ ناچار اب آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ مولوی صاحب سے ملیں اور ان کو یہ خط اپنے نام کا دکھائیں اور میری طرف سے بعد سلام میرے کلیات کے پارسل کا ان کے پاس اور ان کے ذریعہ عنایت سے اس مجلد کا حضرت فلک رفعت نواب مختار الملک بہادر کی نظر سے گزرنا اور جو کچھ اس کے گزرنے کے بعد واقع ہو دریافت کر کے مجھ کو مطلع فرمائیں۔"

نساخ اپنی خودنوشت سوانح حیات کی روشنی میں

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

(سید مقبول الحسن)

کچھ دنوں بعد سررشتہ داری میں جگہ خالی ہوئی۔ نساخ نے اپنے کرم فرما مسٹر بیلی سے سفارش کی درخواست کی۔ بیلی نے حکام بالا کے پاس ان کی سفارش کردی۔ مگر وہاں مقابلہ کا امتحان پاس کرنا ہوتا تھا۔ اس لئے سفارش نہ چل سکی اور نساخ کو امتحان میں شریک ہونا پڑا۔ کامیاب تو ہوئے مگر پوزیشن کچھ نیچے تھی اس لئے جگہ مل سکی۔ اب انھوں نے ڈپٹی مجسٹریٹی کی طرف توجہ کی جس کی خواہش ان کے دل میں مدتوں سے کروٹیں لے رہی تھی۔

انھیں دنوں کلکتہ میں ایک نہایت قابل افسر اے بی کاول آیا ہوا تھا۔ یہ شخص کم وبیش بارہ تیرہ زبانیں جانتا تھا۔ خصوصاً سنسکرت پر تو عبور کامل رکھتا تھا۔ فارسی اور اردو سے بھی دلچسپی تھی مگر ان پر پوری دستگاہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کے لئے اُسے ایک ایسے قابل آدمی کی ضرورت تھی جو اس کی پوری تشفی سے اس کو پڑھا سکے اور اس سلسلہ میں متعدد منشیوں کو آزما چکا تھا مگر کوئی اس کے معیار پر پورا نہ اُترتا تھا یہاں تک کہ کالج (فورٹ ولیم) سے بھی چند منشی طلب کئے گئے مگر سب کے سب "فقط اس وجہ سے لوٹا دئے گئے کہ وہ امتحان میں پورے نہیں اُترے"۔ نساخ جب پہونچے تو حسب عادت اس نے ان کا بھی امتحان لینا چاہا اور اپنی بیوی سے کہا کہ خمسۂ خسرو لے آؤ۔ خمسۂ خسرو کا نام سن کے تو یہ بہت گھبرائے اس لئے کہ خمسہ مذکور میں سے انھوں نے صرف لیلےٰ، مجنوں، شیریں خسرو اور ہشت بہشت کو دیکھا تھا وہ بھی سرسری طور پر۔ مگر چونکہ آدمی باصلاحیت تھے اسلئے زیادہ دقت نہ ہوئی۔ کاول نے مطلع الانوار کے چند اشعار کی تشریح ان سے پوچھی، انھوں نے بتلا دی اور ایسی کہ "صاحب موصوف خوش ہوئے۔ بعدازاں دیوان حافظ کے چند شعر پوچھے۔ ان کے معنی بھی بتلائے۔ بعدازاں دیوان سودا کے اس شعر کے معنے پوچھے"۔

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

نساخ نے اس کے معنی بھی بتلائے۔ اس پر صاحب موصوف نے کہا کہ بعض بعض شخصوں نے دوسرے معنی بتلائے ہیں۔ اُس وقت میں (نساخ) نے اُن سے کہا کہ آپ خود فیصلہ کیجئے کہ میں نے جو معنی بتلائے ہیں وہ معنی اچھے ہیں یا دوسرے معنی اچھے ہیں۔ اس پر انھوں نے دونوں معنوں کا ترجمہ انگریزی میں کرلیا اور دونوں کو دیکھتے رہے آخر میز پر ہاتھ مارا اور کہا کہ آپ کے بتلائے ہوئے معنی اچھے ہیں"۔ غرض اس طرح یہ امتحان میں کامیاب ہوئے اور کاول کے معلم ہوگئے۔ مسٹر کاول کو نایاب اور نادر کتابیں جمع کرنے کا بھی نہایت شوق تھا۔ نساخ کو باضابطہ تاکید کر رکھی کہ اُردو فارسی کی نادر و نایاب کتابیں جہاں سے دستیاب ہوں ڈھونڈ تلاش کرلائیے اور اس پر ان کو کافی کمیشن دیا کرتا۔ نساخ کہتے ہیں "اس سے مجھ کو بڑا فایدہ ہوا"۔

انھیں دنوں کی بات ہے کہ بک دن ان کے "جی میں آیا کہ صدر دیوانی کی سیر کر آؤں۔ وہاں میرے چند احباب بھی ہیں اُن سے ملاقات ہوجائے گی۔ جب پالکی وہاں پہونچی اور میں پالکی سے اُتر کے برآمدہ پر پہونچا اُس وقت رسل صاحب کا چپراسی وہاں تھا۔ اس نے کہا کہ آپ رسل صاحب سے ملاقات کیجئے۔ حالانکہ مجھ کو اُن سے رنج تھا کہ مجھ کو انھوں نے باوجود سفارش کے مترجمی کا عہدہ دیا نہ تھا۔ غرض چپراسی مذکور کے کہنے سے میں گیا۔ اور چپراسی نے مجھ کو اُن سے ملنے کو کہا اس کی غرض یہ تھی کہ اگر میں اُن سے ملاقات کروں تو وہ دوسرے دن آکر مجھ سے ایک روپیہ

لے جائے گا۔ چپراسی نے صاحب مذکور کو خبر دی، صاحب نے مجھ کو بلالیا اور سرد قد تعظیم کی اور ایک کرسی پر کچھ کتابیں تھیں اُن کو خود صاحب موصوف نے اپنے ہاتھ سے اُٹھاکر میز پر رکھ دیں۔ میں اُس کرسی پر بیٹھا اور مجھ سے میرے نوشت وخواند کا ذکر پوچھا۔" پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور اس کے بعد ترجمے کا کام اِن کو مل گیا۔ اس سے ان کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوا۔ ڈھائی تین سو روپیہ ماہوار کمانے لگے۔ بلکہ کسی کسی مہینہ میں تو ایسا ہوا کہ ہزار روپیہ تک آمدنی پہونچ گئی۔

نساخ لکھتے ہیں کہ "اسی طرح (مترجمی کرتے) چند روز گزر گئے کہ ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ میں غدر ہوگیا۔ کلکتہ میں لوگوں کا عجیب حال ہوگیا کہ بیان سے باہر ہے، کولوٹولہ میں میرے چند دوست تھے وہ ایسے مضطرب ہوئے کہ شہر چھوڑ کے میرے گاؤں میں جانے کا ارادہ کیا، میں ان کو سمجھاتا روزانہ کاؤل صاحب کے یہاں جاتا تھا اور اُن سے بالکل صحیح خبریں سُن کے احباب سے کہتا تھا۔ ایک دن یہ خبر معلوم ہوئی کہ کل بارک پور کے سپاہی ہتھیار دیدینگے ورنہ کلکتہ پر تاخت کریں گے۔ اُن دنوں بیشتر اہل یورپ شب کو جہازوں پر جاکے سوتے تھے۔ دوسرے دن میں ایک بجے دن کو گھر سے نکلا۔ گرمیوں کا دن تھا۔ میں نے دو جوڑے کپڑے پہن لئے یعنی دو انگرکھے اور دو پائجامے اور دو موزے اور اپنا دیوان جو اُس وقت تک مرتب نہ ہوا تھا اُس کو بھی لے لیا۔ اور جتنے روپے میرے پاس تھے سب لے لئے اور گھر سے نکلا۔ اس انتظام کا سبب یہ تھا کہ اگر باغی سپاہی شہر میں آگئے تو پھر شاید میرا گھر میں آنا نہ ہو۔ میں جو گھر سے نکلا تو دیکھا کہ شہر میں خاک اُڑ رہی ہے۔ ہر طرف انگریز سوار اور پیدل دریا کی طرف جارہے ہیں۔ ایسا حال میں نے شہر کا کبھی دیکھا نہ تھا۔ میں اسی طرح کاؤل صاحب کی کوٹھی میں گیا تو معلوم ہوا کہ چار بجے تحقیق حال معلوم ہوجائے گا کہ باغیوں نے ہتھیار دیدئے یا نہیں۔ چار بجے سنا کہ باغیوں نے ہتھیار دیدئے۔ اس کے سنتے ہی ایسی خوشی ہوئی کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔" اس کے بعد غدر کا ذکر بالکل ختم ہوجاتا ہے اور صرف اتنا لکھ کر یہ داستان ختم کردیتے ہیں کہ "شہر میں ہر طرح امن ہوگیا۔"

اُس کے بعد یکایک ضیغم کی شاگردی اختیار کرنے کا ذکر شروع ہوجاتا ہے جو مختصراً اس طور پر ہے کہ ضیغم کی شاگردی، اپنے پہلے استاد حافظ رشید النبی صاحب کے ایماء پر اختیار کی گئی۔ حافظ صاحب نے مزید اصلاح دینے سے اس لئے معذرت ظاہر کی کہ وہ نہایت عدیم الفرصت تھے ضیغم کو نساخ نے اول اول ایک زمین کی تین غزلیں دکھلائیں۔ پھر اُن سے فنِ عروض سیکھا اور صنائع بدائع شعری کا علم حاصل کیا جس میں ضیغم صاحب کو خاص کمال حاصل تھا۔ ازاں بعد علم رمل سیکھا۔ کہتے ہیں "ایسا جامع کمالات آدمی نظر نہیں آیا۔ کوئی علم، کوئی حرفہ، کوئی فن نہ تھا جس میں ان کو معقول دخل نہ ہو۔ اور بہت سی باتوں میں کمال رکھتے تھے۔ عروض وصنائع وبدائع میں ایسا کمال تھا کہ ان کی ایک غزل بیس پچیس بحروں میں تھی اور آج تک اتنی بحروں میں کسی شاعر عرب وعجم کا ایک شعر بھی نظر سے گزرا نہیں۔ طب یونانی وانگریزی وہندی میں ایسا کمال رکھتے تھے کہ سو سو جز کا نسخہ ترتیب دیتے تھے۔ کیمیا گر تھے، جواہرات بنانا جانتے تھے اور استغناء حد درجہ کا تھا۔" بہرحال استاد کے تتبع میں ان کو بھی مختلف علوم وفنون سیکھنے کا خیال ہوا۔ فن خطاطی اور علم رمل سیکھ ہی چکے تھے اب جفر کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک شخص مرزا غلام حسین کی، جو اُس زمانہ میں اس فن کا استاد مانا جاتا تھا، شاگردی اختیار کی۔ پھر علم غالب ومغلوب سیکھا۔ اُس کے بعد نجوم سیکھی اور نجوم کے بعد فن شعبدہ بازی۔ کہتے ہیں یہ علم انھوں نے اپنے استاد مولوی ضیغم سے سیکھا تھا۔ ضیغم ایک اچھے شعبدہ باز بھی تھے۔

ڈپٹی مجسٹریٹی کی خواہش نساخ کو ایک عرصہ سے تھی اور وہ مل نہیں رہی تھی۔ اِدھر ان کے بھائی مولوی عبداللطیف خاں صاحب اپنی ذاتی کوشش وصلاحیت کی بنا پر روز افزوں ترقی کررہے تھے اور گورنمنٹ میں اچھا رسوخ بھی پیدا کرلیا تھا۔ نساخ کو لطیف صاحب سے یہ شکایت ہوگئی کہ سگے بھائی ہوتے ہوئے بھی یہ ان کے لئے کچھ کوشش نہیں کرتے درانحالیکہ حکام کی نظر میں کافی نیکنام ہیں۔ شاید ان کی طرف سے بے پرواہیں یا برادرانہ چشمک رکھتے ہیں۔ یہ خیال روز بروز گہرا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک روز جب مولوی عبداللطیف خاں صاحب نے ان سے کہا کہ "تمھارے پاس جو سرٹیفکٹ ہے وہ دیدو کہ ڈپٹی مجسٹریٹی کے لئے درخواست کی جائے" تو نساخ نے سمجھا کہ بھائی صاحب اسی بہانے ان کی سرٹیفکٹ بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔ اسلئے اول کچھ تامل کیا مگر چونکہ خلاف حکم جانے کی ہمت نہ تھی اس لئے مجبوراً دیدیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد تاریخ ۱۸ ستمبر ۱۸۶۰ء کو ان کا (نساخ کا) تقرر ڈپٹی مجسٹریٹی کے "عہدۂ جلیلہ" پر ہوگیا اور ضلع باقرگنج معروف بہ بریسال (مشرقی بنگال) میں پوسٹنگ ہوئی۔ تقرری کے چند روز بعد مولوی عبداللطیف صاحب

نے ایک کتابچہ نساخ کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا کہ "اس میں خطوط انگریزی کی نقلیں ہیں۔ تمہارے متعلق جو خطوط ہیں ان سب کو پڑھ لینا"۔ نساخ کہتے ہیں کہ "میں نے جا بجا بہت سے خطوط انگریزی کی نقلیں بڑے بڑے جلیل القدر انگریزوں کے نام دیکھے جس میں میری نوکری کے واسطے جناب اخوی صاحب قبلہ نے سفارش کی تھی۔ اس سے مجھ کو معلوم ہو گیا کہ وہ برابر میری نوکری کی تدبیر کرتے تھے مگر مجھ سے کہتے نہ تھے اور میں اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر سمجھتا تھا کہ وہ میری نوکری کی تدبیر نہیں کرتے"۔ بہرکیف! عہدۂ مجسٹریٹی پر فایز ہوئے تو حسد کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ مختلف لوگوں نے مختلف طریقوں سے ستایا۔ ایک صاحب نے ان کے عہدہ سنبھالنے سے پہلے ان کے افسر انچارج کو یہ کہکر بدظن کرنا چاہا کہ نساخ محض جاہل آدمی ہے اور قوانین سے کوئی واقفیت نہیں رکھتا۔ مگر عدد شود سبب خیر گر خدا خواہد۔ جب یہ اپنے افسر انچارج سے ملے تو وہ ان سے باتیں کرکے بہت خوش ہوا۔ اور اُس کے تاثرات بالکل برعکس ہو گئے۔

نساخ ایک دیانتدار اور عدل پسند آدمی تھے۔ زندگی بھر کبھی رشوت نہ لی۔ مگر رشوت کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ اُس کی ایک قسم سے نادانستہ طور پر دوچار ہو کر رہے۔ تفصیل اس اجمال کی خود ان کے الفاظ میں اس طرح پر ہے کہ "منشی ثمین الدین (ایک صدر امین) کسی زمیندار یا تعلقدار کے مکان میں کھاتے نہ تھے اور مجھ کو (نساخ) یہ نہایت ناگوار معلوم ہوتا تھا۔ آخر تجربہ سے معلوم ہوا کہ بہت اچھا کرتے تھے۔ کیونکہ امین الدین صاحب (ایک رئیس) روزانہ میرے واسطے کھانے کی چیزیں مثل پلاؤ، قورمہ، کباب، میٹھا چاول، مربہ، مٹھائی، اچار وغیرہ بھیجوا یا کرتے تھے اور میں کھاتا تھا۔ آخر ایک مقدمہ ان کا میرے پاس آیا اور مجھ کو معلوم ہوا کہ حق بجانب اُن کے نہیں ہے بلکہ ایسا معلوم ہوا کہ انھوں نے جو دستاویزات داخل کی ہیں وہ جعلی ہیں۔ اُن کے مختار وکیل سے بارہا کہا کہ وہ لوگ اس مقدمہ کو میری عدالت سے اُٹھا کے دوسری عدالت میں لے جاویں۔ لیکن اُن لوگوں نے نہ مانا اور جب میں نے چاہا کہ اُن کے خلاف فیصل کردوں تو ہر وقت ان کا بھیجا ہوا پلاؤ، قورمہ میرے خیال میں پھرتا تھا اور خیال آتا تھا کہ اگر اُن کے خلاف رائے دوں گا تو وہ کیا کہیں گے اور لوگ کیا کہیں گے۔ لیکن آخر ایسا ہی ہوا کہ میں نے اُن کے خلاف فیصل کیا اور انھوں نے اپیل بھی نہیں کی لیکن لوگوں سے کہا کہ عبدالغفور کے ہاتھ سے مجھ پر ظلم ہوا"۔

بریسال کے بیشتر مقدمات جیسا کہ اوپر ذکر ہوا نہایت پیچیدہ اور مشکل ہوا کرتے تھے۔ بعض تو اس قدر پیچیدہ ہوتے کہ معمولی فہم و فراست اور قوت فیصلہ سے ان کا فیصل کرنا نہایت مشکل ہوتا۔ ایسے حالات میں نساخ کو اپنے علم نجوم سے کام لینا پڑتا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "قیام بریسال میں میں نے بہت سے مقدمے بذریعہ نجوم فیصل کئے"۔ پھر ان مقدمات میں سے ایک کا ذکر کرکے کہتے ہیں کہ "ایک دن ایک مقدمہ میرے پاس آتش زدگی کا پیش ہوا۔ اس میں ایک شخص نے مدعا علیہ پر دعویٰ کیا تھا کہ مدعا علیہ نے بہ سبب عداوت کے اُس کے گھر میں آگ لگا دی ہے اور آٹھ ہزار روپیہ مدعی کا تباہ کر دیا۔ میں نے جو نجوم سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مدعی کا مکان مع اسباب کے بے شک جل گیا ہے مگر مدعا علیہ نے جلایا نہیں بلکہ آپ سے آپ آگ لگ کے جل گیا ہے"۔ پھر تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ بات ٹھیک تھی۔ چنانچہ اسی مطابق فیصلہ ہوا۔

۱۸۶۱ء میں جب ڈپارٹمنٹل امتحان دینے کا وقت آیا تو نساخ کو بڑی دقت پیش آئی۔ کیونکہ تیاری خاطر خواہ نہ ہوئی تھی۔ اس لئے کامیابی مشتبہ تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یعنی فیل ہو گئے۔ اسی ناکامی نے ان کو بڑا صدمہ پہونچایا اور خود اعتمادی کھو بیٹھے۔ لیکن دوسرے سال کامیاب ہو گئے۔

ایک بار یہ کچھ علیل ہوئے، طبیب نے علاج میں افیون تجویز کر دی۔ یہ کھانے لگے۔ بیماری اچھی ہو گئی۔ مگر یہ مسلسل کھاتے رہے یہاں تک کہ عادی ہو گئے۔ روزانہ صبح و شام کابلی مسٹر کے برابر افیون کھا جاتے تھے۔ پھر یکایک خیال ہوا کہ بُری چیز ہے چھوڑ دینا چاہئے۔ کہتے ہیں "فیدلی کی افیون نہیں چھٹتی۔ مگر نساخ کا تجربہ ہے کہ".... پھر یکایک میں نے افیون چھوڑ دی۔ روز اول اعضاء شکنی معلوم ہوئی دوسرے روز اس میں کچھ کمی ہوئی، تیسرے روز کچھ نہ تھا"۔

شاعر جہاں جاتا ہے وہاں چاہے کچھ اور کرے نہ کرے مگر شعر و سخن کی ایک محفل ضرور جما لیتا ہے، نساخ کی پوسٹنگ جب بریسال میں

ہوئی تو مقدمات فیصل کرنے کے ساتھ ساتھ مشق شعر و سخن بھی جاری رہی۔ اور شاگرد بھی بنائے۔ مگر ان شاگردوں میں صرف ایک شخص مسمی الاچی رام المتخلص بہ طالب[1] کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے جن کی غزلوں پر یہ اکثر اصلاح دیا کرتے تھے۔

چند سال بریلی میں کام کرنے کے بعد جب ان کی انتظامی صلاحیت حکام بالا پر اچھی طرح ظاہر ہوگئی تو ان کی تبدیلی پیرو زپور نامی ایک علاقہ میں کردی گئی۔ پیرو زپور نواح بریلی میں ایک نہایت ہی خطرناک جگہ تھی۔ چوری ڈکیتی اور قتل و ڈکیتی کے واردات بند ہوکے پورے علاقہ میں امن و امان ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۸۶۳ء کے لگ بھگ انھیں کلکتہ کے کوارٹر میں واپس بلالیا گیا۔

کلکتہ پہونچتے ہی شعر و سخن کی پرانی محفلیں پھر جمنے لگیں۔ مشاعرے آباد ہوئے اور اشعار سنائے جانے لگے۔ ایک مشاعرہ جس کی طرح تھی:۔

ع "کم عندلیب مست سے اپنا قلم نہیں"۔۔۔ کا ذکر کرکے کہتے ہیں کہ میں نے اس میں شرکت کی اور یہ طرحی غزل پڑھی ؎

کب فیضیاب شادی و وصلت سے ہم نہیں — کب چاک اپنے ہاتھوں سے دامانِ غم نہیں
دلبر جھٹا کسی کا کوئی چال پر چلا، — تعویذ حبِ بغض ہے، نقشِ قدم نہیں
گالی مجھے جو دی تو جلے غیر رشک سے — اِس بت کی دشمنی بھی محبت سے کم نہیں
کٹتے ہیں غیر حال مرا دیکھ دیکھ کر — تیغِ جفا سے تیری، وفا یار کم نہیں
جاں پاتے ہیں رقیب جو ہجراں میں دیکھکر — ہے چشمۂ حیات، مری چشم نم نہیں
کرتا ہے قتل مجھ کو ترا وعدۂ وصال — دم باز! تیغ تیز سے کم تیرا دم نہیں
آسان بہر اہل دول ہے جہاں کی سیر — کم خط جام سے کبھی نقشِ درم نہیں
اُس بت کے ہجر میں جو ٹپکتے ہیں اشک صاف — سنگ چکاں سے کم، مرے چشمانِ غم نہیں
سیرِ جہاں جو ہوتی ہے حاصل کتاب سے — حرفوں کا دائرہ بھی کم از جامِ جم نہیں
حل ہوگیا ہے مسئلہ جبر و اختیار — میں قید زلف یار، اُسے میرا غم نہیں

نساخ ہے جو طائرِ مضموں کی فکر میں
شہباز تیز پر ہے، ہمارا قلم نہیں

مگر ابھی یہ غزل تمام نہ ہونے پائی تھی کہ اہل لکھنؤ کے گروپ میں سے ایک شخص نے ان کو للکارا اور کہا "ذرا غور سے سنئے گا شعر اس کو کہتے ہیں" اور پھر ایک مطلع پڑھا ؎

مرتفع جب اپنی آہوں کا دھواں ہوجائے گا — آسماں ایک اور زیر آسماں ہوجائے گا

نساخ لکھتے ہیں کہ "اس مطلع کے پڑھتے ہی اہل لکھنؤ نے بڑے زور سے تعریف کی۔ میرے دوست مولوی سید عصمت اللہ[2] النسخ کو ناگوار ہوا اور انھوں نے باوجود مخالفت پکار کے کہدیا کہ اس مطلع کا پورا مضمون خواجہ وزیر[3] کا ہے اور خواجہ وزیر کا یہ شعر پڑھ دیا۔ (مگر کتاب میں جگہ خالی ہے اور وہ شعر نہیں دیا گیا)

---

[1] منشی الاچی رام طالب، جلال آباد، ضلع امرت سر کے باشندہ تھے۔ باپ کا نام سوبی رام برہمن تھا۔ ۱۸۶۱ء میں تلاش معاش میں بریلی پہونچے۔ شعر و سخن سے اچھی دلچسپی رکھتے تھے۔ نساخ کے شاگرد ہوئے۔

[2] النسخ، قصبہ پانڈوہ ضلع ہوگلی کے باشندے تھے۔ باپ کا نام چودھری رحمت اللہ تھا۔ النسخ کا سال ولادت ۱۸۳۷ء ہے۔ نساخ کے شاگردوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے اور النسخ، تخلص استاد کے تخلص کی رعایت سے رکھا تھا۔ پہلے مجبوراً تخلص کرتے تھے۔

[3] وزیر ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ محمد فقیر تھا۔ وزیر کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملتا ہے۔ فن شعر میں نا سخ کی شاگردی اختیار کی تھی اور اُن کے ارشد تلامذہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ خود ایک دوسرے مشہور شاعر مولوی فقیر محمد خاں صاحب گویا کے استاد تھے۔ وزیر نے ۱۸۵۳ء میں انتقال کیا۔ تاریخ وفات اس مصرع سے نکلتی ہے:۔ مزہ شعر کا پائے جاتا رہا — وزیر کا وہ شعر جو کتاب میں دیا نہیں گیا۔ غالباً یہ ہوگا:۔

گر زمیں سے ہوگیا دردِ دل سوزاں بلند — آسماں ایک اور زیر آسماں ہوجائے گا

جس پر ان لوگوں کی بڑی خفت ہوئی - کچھ عرصہ بعد مٹیا برج میں ایک مشاعرہ ہوا - طرح تھی ع "آمد فصل بہاری کی چمن میں دھوم ہے"
نساخ نے اس میں شرکت کی اور اس طرح پر تین غزلیں کہیں - تینوں کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں ؎

تیرے جاتے ہی غم و رنج و الم کی دھوم ہے — سینہ سوزاں ہے، جگر پر درد، دل مغموم ہے
زلف سنبل نے سنواری مستی سوسن نے لی — آمد فصل بہاری کی چمن میں دھوم ہے
نے صدا سنتے ہیں نے دیدار ہوتا ہے نصیب — گوش ہیں مہجور چشم منتظر محروم ہے
تشنہ کامی دفع کیا نساخ کی مقتل میں ہو — آب خنجر سے نہ ہو تر، خشک وہ حلقوم ہے

میرے تیرے عشق کی سب مرد و زن میں دھوم ہے — لیلیٰ و شیریں و قیس و کوہکن میں دھوم ہے
تیری باتیں چٹکیاں لیتی ہیں وہ دل میں کہ بس — اے ستمگر مطربانِ زخمہ زن میں دھوم ہے
تیری زلف و چشم و رخسار و قد و اندام کی — نرگس و سنبل، گل و سرو و سمن کی دھوم ہے
جلوہ گر شب کو ہوا وہ مایۂ عیش و نشاط — کس قدر نساخ کے بیت الحزن میں دھوم ہے

آمد فصل بہاری کی چمن میں دھوم ہے — بلبلوں کی بیقراری کی چمن میں دھوم ہے
آمد آمد باغ میں ہے آج کس خوش چشم کی — نرگسوں کی انتظاری کی چمن میں دھوم ہے
وہ کھلے بندوں جو لے نساخ آئے باغ میں — آج گل کی دلفگاری کی چمن میں دھوم ہے

ایک جلسہ میں قوال نے حضرت جامی علیہ الرحمہ کا یہ مطلع پڑھا[1] ؎

احسن شوقی الی دیار لقیت وفیہا جمال سلمیٰ — کہ میرساند نوید لطفش ازاں نواح بجانب ما

احباب نے نساخ سے تقاضہ کیا کہ آپ بھی اسی زمین اور اسی طرز میں ایک غزل کہئے - نساخ نے کہا ؎

تحمل بوسہائے پیہم رکھے نہ شام وصال اصلا — لطف دل لغوم عطف تو ردت وجناہ وصلا
فروغ داغ دل عزیزاں ہے نور سودائے زلف پیچاں — کشمس جن کبرق مزن کبود روہن اذا تجلا،
شب ملاقات یار جانی لئے چلا ساتھ زندگانی — نعاو نفسی نعاو نفسی فان شرخ الشباب ولا

---

[1] حضرت جامی کی پوری غزل اس طور پر ہے :-

احسن شوقی الی دیار لقیت فیہا جمال سلمیٰ — کہ میرساند ازاں نواحی نوید لطفی بجانب ما
بہ داری غم منم فتادہ زام فکرت ندست دادہ — نہ بخت یاور نہ عقل رہبر نہ تن توانا نہ دل شکیبا
زہے جمال تو قبلۂ جاں حریم کوئے تو کعبۂ دل — خان سجد نالیک نسجد وان سیعنا الیک نسعیٰ
زسر عشق تو بود ساکن زبان رباب شوق لیکن — زبے زبانی غم نہانی چنانکہ دانی شد آشکارا
اگر بجرم برآوری جاں وگر بہ تیغم بیفگنی سر — قسم بجانت کہ برندارم سرارادت زخاک آں پا
بناز گفتی فلاں کجائی چہ بود حالت دریں جدائی — مرضت شوقاً دمت ہجراً کیف اشکوا الیک اشکوا

برآستانت کمینہ جامی مجال بودن ندید ازاں رو
بلنج فرقت نشستہ محزوں بکوئے محنت گرفتہ ماوا

کشاں کشاں اشتیاق خنجر گلی میں لاتا تیرے ستمگر — لادت کفی ولست اذی اباذل ماسلت ام لا
فزوں ہے اخگر سے داغ سینہ ہی برق خرمن ہمیں تو بینا — قلیت داخلۃ حشاہ علی لظی الشوق مینک تقلا
کمال انوار روئے روشن نگہ کو کرتا ہے درد گلخن — ضلال قلبی ضیاء عین ومن سبتہ . الامی تقلا

ہمیں تو نساخ ہے یہ غم کہ وہ پری چہرہ جان عالم
سریع دخل بطی قیسی اذا تملی الخلیط ملا

کلکتہ آئے ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ ۱۸۶۳ء کے اواخر میں ان کا تبادلہ راجشاہی ہوگیا۔ اس مختصر قیام کی دیگر ادبی مشغولیتوں میں دیوان دفتر بے مثال اور اردو ترجمہ پندنامۂ عطار موسوم بہ چشمۂ فیض کی اشاعت خاص طور پر قابل ہیں۔

کلکتہ سے راجشاہی جاتے ہوئے مرشد آباد راہ میں پڑتا ہے۔ نساخ ایک دن کے لئے اتر پڑے۔ جن عمایدین شہر سے ملاقات ہوئی اُن میں منشی اعظم الدین صاحب کاکوروی دیوان نواب ناظم بہادر آف بنگال اور "سرآمد علماء زماں" مولانا نجف علی خاں المتخلص بہ خستہ باشندہ جھجھر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خستہ نہایت قابل و فاضل شخص تھے اور بقول نساخ "ان کو زبان عربی و دری میں ایسا دخل تھا کہ شاید ہند میں اور کسی کو نہ تھا" اور ان کی تصانیف میں سیکڑوں کتابیں ہیں اُن میں سے مقامات حریری کی ایک بے نقط شرح بھی ہے"۔ راجشاہی پہونچ تو ان سے پہلے ان کی شہرت وہاں پہونچ چکی تھی۔ یہاں جن لوگوں سے تعلقات بڑھے اُن میں مولوی امجد علی خاں ابن چودھری دوست محمد خاں رئیس راجشاہی پیرو میاں صاحب سجادہ نشین اور شاہ مہر علی مدنی پوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شاہ صاحب موصوف ایک صوفی منش اور درویش صفت آدمی تھے اور نساخ کو ایسے لوگوں سے فطری طور پر حسن عقیدت اور گرویدگی تھی اس لئے بہ نسبت دوسروں کے شاہ صاحب سے ان کے تعلقات زیادہ گہرے ہوئے۔ یہ ۱۸۶۴ء کے لگ بھگ کی بات ہے اس وقت نساخ کی عمر کم و بیش اٹھتیس تیس سال کی تھی۔ نساخ کہتے ہیں کہ "دوران قیام راجشاہی میں میں نے مرزا ہمایوں بخت ابن مرزا خرم بخت ابن مرزا جواں بخت معروف بہ مرزا جہاندار شاہ ابن شاہ عالم بادشاہ دہلی کی دختر نیک اختر سے شادی کی"۔

یہیں کا ذکر ہے کہ ایک دن چند برموگیانی[1] حضرات نے ان سے اسلام کے کثرت ازدواج کا مسئلہ پوچھا اور اس کے لئے عقلی دلایل مانگے۔ نساخ کہتے ہیں کہ میں نے دو دلیلیں دیں۔ اول یہ کہ "کفار سے اور نصرانی سے اور یہودی سے لڑائیاں ہوتی تھیں۔ اس میں مسلمان لوگ مارے جاتے تھے۔ اور فرض کیجئے کہ اوایل اسلام میں تین چار سو مرد اور تین چار سو عورتیں مسلمان ہوئی تھیں۔ بعد ازاں کفار سے لڑائی میں چند مسلمان مرد مارے گئے اور ان کی عورتیں بیوہ رہ گئیں اور وہ مسلمان ہیں اُن کے قرابت دار کفار اُن کو بلایا کرتے تھے کہ وہ عورتیں پھر ان کے پاس پہونچ جائیں اور دین اسلام چھوڑ دیں۔ اب ان عورتوں کو چھوڑ دینا مناسب نہیں تھا۔ اور جب ان عورتوں کو چھوڑ نہیں سکتے تو ضرور ہوا کہ ان کے خورد و نوش کی فکر کریں۔ بس ضرور ہوا کہ ان عورتوں سے نکاح کر لینا چاہئے۔ ایسے وقت میں ایک ایک مرد کی دو دو بیبیاں ہوگئیں اور اسی طرح چار تک جایز رکھا گیا"۔ پھر کہا کہ "حقیقت میں ایسا ہو" میرے مذہب کی کسی کتاب سے ثابت نہیں ہے۔ لیکن آپ لوگوں کے پوچھنے پر میں نے یہ عقلی دلیل بیان کی۔ اور دوسری عقلی دلیل "بہت صاف اور روشن یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو آدمی کو مخلوق کیا تو اس کی غرض اس سے یہ تھی کہ ابن آدم اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں پس ایک مرد کی اگر ایک بی بی سے زاید بیبیاں ہوں گی تو اولاد زاید ہوگی"۔

(باقی)

---

[1] دراصل برہموگیانی ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کو برہما کا گیان یا عرفان حاصل ہو۔ یہ توحید کے قایل ہوتے ہیں۔ یعنی خدا (برہما) کو واحد لاشریک مانتے ہیں۔ جو ویدانت کی اصل تعلیم ہے۔ مشہور برہموگیانیوں میں راجہ جنک (شری رامچندر جی کے سسر) اور شری کرشن جی کا نام سرفہرست ہے۔ برہموگیانیوں کو برہمو سماجیوں سے خلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔ یہ اور ہیں اور وہ اور۔ "م - ح"

فلاسفہ کا تصورِ الٰہ

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

عیسائی فلاسفہ

(نواب) محمد عباس طالب صفوی

تمہید ازمنۂ وسطیٰ تک فلسفہ کو اناجیل اربعہ کے مطابق کرنے کی سعی تو کی گئی مگر خود اناجیل اربعہ کو ہر قسم کے نقد و بصر سے بالاتر سمجھا گیا عصرِ جدید میں ٹامس ہابس (۱۶۷۹-۱۵۸۸ء) نے رومن کیتھولک فرقے پر اعتراض کے پردے میں عہد نامۂ عتیق اور عہد نامۂ جدید پر بھی نقد و تبصرہ کیا[1] اور پھر رفتہ رفتہ اس نے اس عقیدے کی صورت اختیار کر لی کہ اناجیل اربعہ بالعموم اور سینٹ پال (یعنی پولوس رسول کے تعلیمات) بالخصوص یونان کے فلاسفہ کے افکار کے رہینِ منت ہیں[2] اور اس نئے عقیدے کے پرجوش حامیوں نے یہ سمجھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں فرمائی کہ پولوس رسول وطناً یونانی سہی مذہباً یہودی تھے اور عیسائی مذہب قبول کرنے کے بعد بھی پولوس رسول نے کبھی یہ تحریر کیا کہ "کہاں کا حکیم؟ کہاں کا فقیہ؟ کہاں کا اس جہاں کا بحث کرنے والا؟ کیا خدا نے دنیا کی حکمت کو بے وقوفی نہیں ٹھہرایا؟"[3] اور کبھی صریح الفاظ میں یونانیوں کے فلسفے سے یہ فرما کر تبرا کیا کہ "یہودی نشان چاہتے ہیں اور یونانی حکمت تلاش کرتے ہیں مگر ہم اس مسیح مصلوب کی منادی کرتے ہیں جو یہودیوں کے نزدیک ٹھوکر اور غیر قوموں کے نزدیک بے وقوفی ہے"[4]

میں یہ تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں کہ چونکہ پولوس رسول نے کرنتھیوں کے نام کے اسی خط میں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "پھر بھی ہم کاملوں میں حکمت کی باتیں کرتے ہیں لیکن اس جہان کی اور اس جہان کے نیست ہونے والے سرداروں کی حکمت نہیں بلکہ خدا کی وہ پوشیدہ حکمت بھید کے طور پر بیان کرتے ہیں جو خدا نے جہان کے شروع سے پیشتر ہمارے جلال کے واسطے مقرر کی تھی"[5] اور چونکہ پولوس یہودی خاندان کا ایک فرد ہونے کے باوجود یونان کے ایک شہر "ترسس"[6] یعنی طرسوس میں پیدا ہونے کی وجہ سے یونان کے مذہبِ اسرار سے بھی ناواقف نہیں تھے لہٰذا ابتدائی نصرانیت میں مذہبِ اسرار کا سبب قوی پولوس تھے لیکن میں اس بات کے لئے ماننے کے لئے طیار نہیں ہوں کہ لوگوس کے نظرئے یا تثلیث کے عقیدے

---

[1] Leviathan By Thomas Hobbes pages 209, 214, 215

[2] History of Western Philosophy pages 328, 344.
Jesus or Paul By Shaw Desmond pages 112 - 113.

[3] "کرنتھیوں کے نام پولس رسول کا پہلا خط"، آیات ۲۱ - ۲۰

[4] حوالۂ سابق آیات ۲۳ - ۲۲

[5] "کرنتھیوں کے نام پولس رسول کا پہلا خط" آیات

[6] "اعمال" باب ۲۲ آیت ۳

یا دیگر فلسفیانہ نظریات کا ذمہ دار بھی پولوس کو قرار دیا جائے۔

ان فلسفیانہ نظریات کے نبایع کے لئے ہمیں اناجیل اربعہ کا مطالعہ کرنا ہوگا جو محققین کی نظر میں حضرت عیسیٰ کے کم از کم پچاس برس بعد مختلف اوقات میں تقریباً بیس اشخاص نے مدوّن کیں[1]۔

ان اناجیلِ اربعہ میں تین انجلیں یعنی متی کی انجیل، مرقس کی انجیل اور لوقا کی انجیل بڑی حد تک یہودیوں کی مقدس کتابوں سے مشابہ ہیں بلکہ جیسا پروفیسر ڈیویز نے بحیرۂ مُردار کی وادیٔ قمران سے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک کے حاصل کئے ہوئے قبل مسیح کے چرمی مخطوطات کے مطالعہ کے بعد تحریر فرمایا ہے نصرانیت کے شیوع سے کچھ ہی قبل یہودیوں کا ایک فرقہ بحیرۂ مُردار کے گرد و نواح میں موجود تھا اور عیسائیوں کے اناجیل اسی فرقے کی مقدس کتابوں سے ماخوذ ہیں[2] اور جیسا کہ پروفیسر برٹرنڈ رسل نے اس عقیدے کے باوجود کہ نصرانیت پولوس کی وجہ سے یونان زدہ ہوگئی، یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ اناجیل کے اخلاقی تعلیمات یہودیوں کے فریسی فرقے کے ایک مصنف کی تصنیف سے ماخوذ ہیں جو ۱۰۰-۱۰۹ء ق۔م میں تصنیف کی گئی[3]۔

بے شک یوحنا کی انجیل کی کیفیت ان اناجیلِ ثلثہ سے قطعاً الگ ہے اور اس کا آغاز ہی لوگوس کے نظریہ سے کیا گیا ہے یعنی "ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا"، اور اسی باب اول میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ تمام اشیاء کلام کے وسیلہ سے پیدا ہوئے کلام میں زندگی تھی اور وہ حیات آدمیوں کا نور تھی۔ "حقیقی نور دنیا میں آنے کو تھا وہ دنیا میں تھا اور دُنیا اُس کے وسیلے سے پیدا ہوئی اور دُنیا نے اُسے نہ پہچانا اور کلام مجسّم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا"[4] لوگوس کے اس نظریہ کے علاوہ یوحنا کی انجیل میں حضرت عیسیٰ کے قدیم ہونے کا عقیدہ بھی موجود ہے اور کہا گیا ہے کہ آں جناب حضرت ابراہیم سے قبل موجود تھے[5] اور خدا اور حضرت عیسیٰ کی عینیت کا نظریہ بھی ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے - میں اور باپ ایک ہیں[6]۔ اسی عینیت کے عقیدہ کو یوحنا کی انجیل کے سولھویں باب کی ستائیسویں اور اٹھائیسویں آیتوں میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ میں باپ کی طرف سے نکلا میں باپ سے نکلا اور دنیا میں آیا ہوں۔

یوحنا کے ان عجیب و غریب نظریات کی وجہ سے اُن کی انجیل کو کئی قرنوں تک شک و شبہ کی نظر سے دیکھا گیا اور ۱۷۰-۱۸۰ء کے مابین ایشیائے کوچک کے کلیسا کی ایک جماعت نے اس خیال کا اظہار کیا کہ چوتھی انجیل یوحنا کی تالیف نہیں بلکہ ایک بے دین سیرن تھوس کی تصنیف ہے جو حضرت عیسیٰ کو خدا سمجھتا تھا[7]۔ بہرنہج نصرانیت یہودیت کے محدود دائرے سے نکل کر غیر یہودی اقوام میں شایع و ذایع اسی یوحنا کی انجیل اور پولوس کے ان احکام کی وجہ سے ہوئی کہ ختنہ غیر ضروری ہے اور اکل و شرب میں کوئی پابندی نہیں ہے[8] اور دوسری صدی عیسوی کے ناسٹک فرقے نے بھی یوحنا کی انجیل کے نیم مذہبی اور نیم فلسفیانہ نظریات سے تمتع حاصل کیا۔ ناسٹک فرقے کو تمام محققین نے دوسری صدی عیسوی کا ایک ملحد عیسائی فرقہ تسلیم کیا ہے صرف پروفیسر ڈیویز ڈی، ڈی نے ناسٹک فرقے کو ایک ملحد یہودی فرقہ سمجھا ہے[9] لیکن چونکہ ناسٹک فرقہ کا اساس الاصل یہود

---

[1] All About New Testament Criticism By F. C. Conybeare p. 1

[2] The Meaning of Dead Sea Scrolls By A. P. Davies p. 42

[3] A History of Western Philosophy pp. 339-40.

[4] "عہدنامہ یوحنا کی انجیل" شایع کردہ برٹش اینڈ فارن سوسائٹی لاہور صفحہ ۹۸ [5] حوالۂ سابق صفحہ ۱۰۰

[6] حوالۂ سابق۔

[7] All About New Testament Criticism pages 1-2.

[8] A History of Western Philosophy page 344.

[9] The Meaning of Dead Sea Scrolls page 76.

کو معاذ اللہ برا کہنا اور خالقِ شر سمجھنا ہے[1]۔ اور چونکہ یہودیوں کا کوئی گمراہ فرقہ بھی یہواہ کو برا نہیں کہتا لہذا میں پروفیسر ڈیوبز سے متفق نہیں ہوں۔ میری رائے میں ناسٹک فرقہ یونانی فلسفہ کے ساتھ ایرانی فلسفہ ثنویت سے بھی متاثر ہوا اور اس طرح ہمارے عصر کے مشہور فلسفی مارٹن ببر کے الفاظ میں نصرانیت کے چشمے کو یہودیت کے منبع کے علاوہ یونانی اور ایرانی ینابیع سے بھی تقویت پہونچی[2]۔

ناسٹک فرقے کا یہودیوں کے علی الرغم یہ خیال تھا کہ محسوسات کی کائنات کو عقل کی دیوی صوفیہ کے باغی لڑکے نے خلق کیا اور وہی یہواہ ہے۔ عرصہ دراز تک خدائے حقیقی نے یہواہ کی [illegible] اپنے لڑکے مسیح کو جامۂ بشری پہنا کر اس کائنات میں بھیجا تاکہ دنیا کو حضرت موسیٰ کی معاذ اللہ غلط تعلیم سے نجات حاصل ہو۔ اُن کے نزدیک یہ کائنات خالقِ ظلمت یہواہ کا محبس ہے اور اس زندانِ بلا سے نجات صرف اس شکل میں حاصل ہو سکتی ہے جب انسان رہبانیت اختیار کرے اور حضرت عیسیٰ کی ظاہری تعلیم سے صرفِ نظر کرنے کے بعد آں جناب کی اس باطنی تعلیم پر عمل پیرا ہو جو آپ نے چند مخصوص حواریین کو دی تھی اور جس کا لب لباب یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق یہواہ ظلمت کا دیوتا اور خدائے حقیقی یعنی نورِ مطلق کا دشمن ہے، لہذا انسان کو کائنات کی ظلمت سے نجات حاصل کرنا چاہئے اور فرزندانِ نور میں شامل ہو جانا چاہئے[3]۔

ناسٹک فرقہ کی طرح مانوی فرقہ کے نظریات بھی جناب زرتشت کی نور و ظلمت کی ثنویت کی طرف مائل تھے۔ مانوی فرقے کا بانی ایرانی النسل مانی کو بتایا جاتا ہے، جس نے [illegible] میں انتقال کیا۔ مانی نے نصرانیت میں ناسٹک فرقے کے عقاید کے ساتھ پارسی مذہب کے معتقدات کو بھی عیسائی مذہب کا جزو بنانا چاہا اور یہ بتایا کہ اس کائنات میں جو ہر نور مادے کے محبس میں قید ہو گیا ہے اور اس قید سے روح کو صرف اس صورت میں نجات حاصل ہو سکتی ہے جب وہ تمام مادی اشیاء سے قطعِ تعلق کر کے کامل رہبانیت اختیار کرے۔ مانوی مذہب میں گوشت اور شراب کے علاوہ شکیت، مزدوری، نوکری اور شادی بھی ممنوع تھی۔ حضرت عیسیٰ کو مانوی خدا کا اوتار سمجھتے تھے جو ابن آدم کو گناہ سے نجات دینے کے لئے اس کائنات میں آیا[4]۔

رومۃ الکبریٰ کی شہنشاہیت کے عیسائی مذہب اختیار کرنے کے وقت تک ناسٹک اور مانوی فرقوں کی خوب تبلیغ کی گئی لیکن اس کے بعد ان دونوں فرقوں کو کتمانِ عقاید پر مجبور ہونا پڑا اور رفتہ رفتہ یہ دونوں فرقے معدوم ہو گئے[5]۔

یہ توقع بے جا نہ تھی کہ یوحنا کی انجیل اور درجِ بالا فرقوں کے نیم فلسفیانہ اور نیم مذہبی خیالات یونان کے فلاسفہ کی نظر میں اس یہودی مذہب سے بہتر ثابت ہوتے جو پروفیسر رسل کے الفاظ میں نہایت عام فہم اور فلسفیانہ مابعد الطبیعیات اور غوامض سے قطعاً خالی تھا[6]۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ نصرانیت فلسفہ کی طرف مائل ہونے کے بعد بھی فلسفہ کو اپنا نہ بنا سکی اور وہی یونانی اور رومی فلاسفہ جو حضرت موسیٰ کو یہودیوں کا افلاطون اور افلاطون کو یونانیوں کا موسیٰ کہتے تھے[7]۔ نہ صرف نصرانیت کے خلاف صف آرا ہو گئے بلکہ نصرانیت کے ان دونوں ملحد فرقوں سے بھی

---

[1] A History of Philosophy By Thilly page 166
[2] Eclipse of God By Martin Buber page 138
[3] A History of Western Philosophy By Russell p. 346
[4] A History of Philosophy By Thilly page 166.
[5] Ibid page 172.
[6] A History of Western Philosophy By Russell p. 345
[7] Ibid page 346
[8] History of Philosophy By Weber page 126.

جنگ و جدل پر آمادہ ہو گئے جن کو مذہب سے کہیں زیادہ فلسفہ سے لگاؤ تھا۔ ان فلسفیوں نے محض دلایل عقلی کو ناکافی سمجھ کر اناجیل اربعہ کی طرح متقدمین اور علی الخصوص افلاطون کے اقوال کو جمع کیا اور اس سلسلہ میں متعدد کتابیں غلط طور سے متقدمین سے منسوب کی گئیں[۱]۔ فیثاغورث اور افلاطون کے صحیح اور مجہول اقوال کو بائبل کے ارشادات کے مقابلہ میں زینوفینیز۔ سقراط اور ارسطو کے خدا کو پیش کیا گیا اور اسی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ نصرانیت کی ضد میں مشائین اور رواقیین کی وحدت کو بھی یونانی دیومالا کی کثرت میں تبدیل کر دیا گیا[۲]۔ یہاں تک کہ فلاطینس ایسے قایل وحدت الوجود نے بھی بت پرستی کی یہ تاویل کی کہ بت پرست بتوں میں حقیقۃً خدا کا جلوہ دیکھا ہے[۳]۔ اور نہ صرف عیسائیوں کے ملحد ناسٹک فرقہ کی رہبانیت اور مراقبے پر اعتراض کیا[۴] بلکہ نصرانیت کے اصل الاصول یعنی حضرت عیسیٰ کے منجی ہونے کے عقیدے پر بھی ان الفاظ میں اعتراض کیا کہ گناہگاروں کے لئے یہ جایز نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو نجات دہندہ سمجھیں[۵] اور جس طرح چند صدیوں کے بعد نام نہاد مسلمان فلاسفہ کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے مسلمان متکلمین کو فلسفہ پڑھنا پڑا اسی طرح عیسائی متکلمین کو فلسفہ کے دامن میں پناہ لینا پڑی[۶]۔ لیکن چونکہ دونوں کا مطمح نظر مذہب کی حفاظت تھی نہ کہ فلسفہ کی تعلیم لہذا نہ مسلمان متکلمین کو صحیح معنوں میں فلسفی کہا جا سکتا ہے اور نہ عیسائی بطریقوں کو۔ بہرنہج چونکہ عصر جدید میں کوئی ایک فلسفی بھی ایسا نہیں جسے صحیح طور سے عیسائی کہا جا سکے لہذا زمنہ وسطیٰ کے قبل کے عیسائی متکلمین کا ذکر عیسائی فلاسفہ کے عنوان کے تحت کیا جاتا ہے۔

(باقی)

---

۱ History of Philosophy By Weber page 127 Foot Note 1
۲ Ibid page 125.
۳ Plotinus By Armstrong page 160.
۴ Ibid pages 145-46.
۵ Ibid page 112.
۶ A History of Philosophy By Thilly page 167.

بعض نایاب کتابیں

(چوتھائی قیمت پیشگی ملنا ضروری ہے)

کلیات صہبا: (عنقا) — قصاید عرفی: (۳۵ر) — ہشت بہشت: (للعہ ر) — مسطلحات وارستہ: (۵ر) — مثنوی قران السعدین: (للعہ ر)
کلیات سعدی شیرازی: (۳۵ر) — غیاث اللغات مع چراغ ہدایت: (۱۵عہ ر) — گلستان قآنی: (۵ر) — بہارستان جامی و لوامع جامی: (للعہ ر)
سوانح عمری امیر تیمور و حمیدہ بانو بیگم: (۳۵ر) — توزک جہانگیری اردو: (عنقا ر) — حدیقۃ الاولیاء آخر ناقص: (۳۵ر) — حیات جامی (۳۵ر)
کلیات انشاء اللہ خاں انشاء: (۱۵عہ ر) — دیوان مصحفی: (۵ر) — دیوان رند: (۵ر) — تجلائے شہاب ثاقب مع سوانح ثاقب: (معہ ر) —
ریاض رضوان: (۱۵عہ ر) — کلیات نظیر اکبر آبادی: (۳۵ر) — دیوان درد: (غا ر) — انتخاب داغ: (۳۵ر) — کلیات ولی: (عنقا ر)
کلیات نظیر اکبر آبادی، مرتبہ عبدالباری آسی: (۱۵عہ ر) — صنمخانۂ عشق: (معہ ر) — نظم دل افروز: (۳۵ر) — دیوان مجروح: (للعہ ر)
آفتاب داغ: (للعہ ر) — ترانہ - یگانہ: (للعہ ر) — گلزار داغ: (عنقا ر) — بہار داغ: (للعہ ر) — یادگار داغ: (معہ ر) —
کلیات میر تقی میر: (معہ ۱۵عہ ر) — دیوان ناظم - نواب محمد یوسف علی خاں ناظم رامپوری: (۱۲عہ ر) — کلیات سودا جدید اڈیشن: (عنقا ر)
کلیات میر تقی میر جدید اڈیشن: (۲۵عہ ر) — دیوان بیدل دہلوی: (۱۲عہ ر) — دیوان میر اثر: (للعہ ر) — مثنوی میر حسن: (بہر) — منیجر نگار لکھنؤ

اقبال اور نظریۂ جمہوریت

(اشتراکیت و اشتمالیت)

(غلام ربانی عزیز)

انسان نے منزلِ مدنیت میں قدم رکھا ہی تھا کہ ابنائے جنس کے کچلنے کی فکر اسے دامن گیر ہوگئی اور ہوشیار طبقہ معاشرے کے سیاہ وسفید پر چھاگیا - ان پھندوں میں سے ایک کا نام جمہوریت ہے - اگرچہ کہنے کو تو نظام جمہوریت میں اختیارات کی باگ عوام کے ہاتھ میں ہوتی ہے، وہ خود ہی حاکم اور خود ہی محکوم ہوتے ہیں - لیکن حقیقت یہ ہے کہ چند خود غرض افراد، دولت و رسوخ کے زور سے زندگی کے ہر شعبہ پر چھا جاتے ہیں - معاش کے تمام وسایل بااختیار طبقہ کے ہاتھ میں آجاتے ہیں - اشیائے خورد و نوش اور اسبابِ زندگی بازار سے نابود ہوجاتے ہیں اور آخر کار عوام کس مپرسی اور بے بسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں -

اس وقت دُنیا کی اکثر حکومتیں جمہوری کہلاتی ہیں اور رعایا کی بہبودی ان کے منشور کی اہم دفعہ ہے - لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے - اقبال کی فکر دوررس نے آج سے بہت پہلے ان خطرات کے خیال کا صحیح اندازہ لگالیا تھا - چنانچہ وہ خضرِ راہ میں جناب خضر سے دریافت کرتا ہے :-

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے

یہ نظم آج سے کوئی چالیس برس پہلے لکھی گئی - ہندوستان میں انگریزی اقتدار شباب پر تھا - پہلی جنگ عظیم جو مغرب کی بے راہ روی کے خلاف فطرت کا ہیبت ناک ردِ عمل تھا - ختم ہونے کو تھی - قیصر کی ہوس جہاں گیری خواب پریشاں بن کر رہ گئی تھی - زارِ روس کا قصرِ استبداد سیلابِ حوادث کے ہاتھوں زمیں بوس ہوچکا تھا - آزادی کی پہلی صبح پھوٹنے کو تھی اور تھکی ماندی دنیا جمہوریت سے ہمکنار ہونے کے لئے تڑپ رہی تھی -

اس موقعہ پر اقبال نے خضر کی زبانی یہ حقیقتِ کبریٰ دُنیا کے سامنے پیش کی - " سلطنت کا خمیر ہی ایسی مٹی سے اُٹھایا گیا ہے کہ وہ ہر شکل میں انسانیت کے لئے سمِ قاتل ہے، شخصی حکومت میں تمام ملک ایک شخص واحد کی اشاروں پر ناچتا ہے - جمہوری نظام میں فرد کی جگہ جماعت لے لیتی ہے - بلکہ جماعت کا لیڈر اس کی روح رواں ہوتا ہے - سبھی اس کے حکم کے بندے ہوتے ہیں - جو وہ چاہتا ہے سبھی وہی کرتے ہیں - عوام کو اول تو فکرِ معاش سے سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی - سیاسی بیداری کھاتے پیتے لوگوں کا مشغلہ ہے - لیکن اگر ایک آدھ آواز اُٹھے بھی - تو ایسے سرپھرے کو خطابات اور انعامات کی افیون کھلاکر سُلا دیا جاتا ہے - اور وہ اربابِ اختیار کا ہمنوا ہوکر اسی جماعت میں مل جاتا ہے -

اس کے بعد خضر گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں :-

" ممکن ہے اہل دنیا مغربی نظام جمہوریت سے آس لگائے بیٹھے ہوں - انھیں کہدو - کہ اس نظام میں بھی تمھاری نجات کی کوئی صورت نہیں اور اس ساز سے بھی وہی انا و لاغیری کی دل خراش آواز آرہی ہے جو کبھی کبھی اسمبلیوں اور کونسلوں میں عوامی حقوق پر گرما گرم بحثیں ہوجاتی ہیں - ان کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ جاہ پرست طبقہ خیر خواہی کی آڑ میں اپنی مطلب برآری کرتا ہے اور اہلِ دُنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے - ہر رکن مجلس کے دماغ میں ایک چھوٹا سا انا موجود ہے، وہی اس کا معبود ہے، اور وہی مسجود "

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ جب ملکۂ سبا کو حضرت سلیمان کا چیلنج پہونچا کہ اسلام لے آؤ، ورنہ جنگ کے لئے طیار ہو جاؤ تو ملکہ نے مشیروں کو بلایا۔ کسی نے لڑائی کا مشورہ دیا، کسی نے کہا تحفے تحائف بھیج کر بلا کو ٹال دو۔ کسی نے کہا صلح کر لو۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں آخر ملکہ نے کہا۔ میں تو صلح کے حق میں ہوں۔ کیونکہ جب بادشاہ (کامیابی کے نشے میں) بدمست ہو کر دوسرے ملک میں داخل ہوتے ہیں تو (اپنی مقصد برآری کے لئے) وہاں کی رعایا کے مختلف طبقوں میں فساد کراتے ہیں اور معزز گھرانوں کو ذلیل و رسوا کرتے ہیں اور یہ ان کا پرانا معمول چلا آرہا ہے۔ کیا خوں آشام ملوکیت کے ناپاک عزائم کا اس سے بہتر نقشہ کھینچنا ممکن ہے۔

خواب سے بیدار ہو جاتا ہے محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ، اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

مغربی نظام جمہوریت سے اقبال کی بیزاری کی وجہ صرف یہی نہیں کہ وہ اوصاف و خصایل میں ملوکیت کا بدترین مظہر ہے۔ بلکہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں گھوڑے اور گدھے کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔ اقبال کچھ عرصہ تک لاہور کے شہری حلقہ کی طرف سے پنجاب کی مجلس قانون ساز کے ممبر رہے۔ انھیں کیا معلوم کہ کونسل ہال میں ان کے رفقائے کار کون ہوں گے۔ دیکھا کہ ارباب غرض نے صوبے بھر کے ان پڑھ زمیندار اور بنیئے جمع کر رکھے ہیں۔ لکھنا پڑھنا، کہنا سننا سب انگریزی میں تھا۔ یہ مصیبت کے مارے بیٹھے اونگھا کرتے اور جب رائے شماری کا وقت آتا۔ امام کے پیچھے اللہ اکبر کہہ دیتے۔ اس سے کیا غرض کہ منہ کعبہ کی طرف ہے یا ہر دوار کی طرف۔ پانچ برس تک یہ مرد مومن کڑھتا اور خونِ جگر پیتا رہا۔ آخر اس نتیجہ پر پہونچا کہ جس چھت کے نیچے اقبال اور آئن سٹائن جیسے مفکر، گھسیٹے اور مسیتے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ ایسی مجلس آئین ساز اور ایسے نظام جمہور پر تین حرف۔ پھر کبھی انتخاب کے لئے کھڑے نہ ہوتے۔ ہواخواہوں نے مجبور کیا بھی تو خاموش رہے۔ بہت پیچھا کیا تو یہ کہہ کر مسکرا دئے۔ "میاں! یہ روگ ہمارے بس کا نہیں۔ ہم اس کا مزا چکھ چکے ہیں۔" ارشاد ہوتا ہے:-

اس راز کو اک مرد فرنگی نے کیا فاش ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے بعد سے ملک نہایت تیزی سے مکمل آزادی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا اور ہندوستان کا ایک عریاں تن قاید قوم کو انگریز کے خلاف آخری ٹکر کے لئے طیار کر رہا تھا۔ ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ ہندو مسلم فسادات زوروں پر تھے۔ وزارتیں بن بن ٹوٹ رہی تھیں وفد آ آ کر ناکام لوٹ رہے تھے۔ سیاسی رہنما سر جوڑ جوڑ کر بیٹھتے اور ناکام اٹھ جاتے۔ ہر طرف ہنگامہ برپا تھا اور ملک کسی ایسے رہنما کی تمنا کر رہا تھا، جسے دولت اور منصب فریب نہ دے سکے۔ لیکن ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا:-

امید کیا ہے سیاست کے پیشواؤں سے یہ خاکیا نہیں رکھتے ہیں خاک سے پیوند
ہمیشہ مور و مگس پر نگاہ ہے ان کی جہاں میں ہے صفتِ عنکبوت ان کی تمند
خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع تخیل ملکوتی و جذبہ ہائے بلند

ان حالات سے اقبال کا دل جل اٹھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس انسان کشی اور آدم خوری کا منبع کہاں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس ملک میں سب کچھ یورپ کی تقلید اور فرنگستان کے تتبع میں ہو رہا تھا۔ انسانیت کراہ رہی تھی اور عوام بدحال سے بدحال تر ہوتے جا رہے تھے۔ چنانچہ ان سب مفاسد کو دیکھتے ہوئے اقبال گلشن راز میں کہتا ہے :-

فرنگ آئین جمہوری نہاد است — رسن از گردنِ دیوے کشاد است
زباغش کشتِ ویرانے نکوتر — زشہرِ او بیا بانے نکوتر
رواں خوابید و تن بیدار گردید — ہنر با دین و دانش خوار گردید
خرد جز کافری، کافرگری نیست — فنِ افرنگ جز مردم دری نیست
گروہے را گروہے در کمین است — خدایش یار اگر کارش چنین است

مغرب کی غارتگری کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ اقبال اہلِ مغرب کو اس طرزِ حکومت کے نتائج بد سے ڈراتا ہے۔ کہ نا تربیت یافتہ جمہور کی حکومتیں بدمست حبشی کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہے، یہی نہیں کہ وہ دوسروں کا گلہ کاٹ کر رکھ دے گا، اپنی رگِ حیات کو بھی کاٹنے سے دریغ نہیں کرے گا :-

زمن دہ اہلِ مغرب را پیامے — کہ جمہوری ست تیغِ بے نیامے
چہ شمشیرے کہ جانہائی ستاند — تمیزِ مسلم و کافر نہ داند
نہ ماند در غلافِ خود زمانے — برد جان خود و جان جہانے

جب حکومت جمہور سے عوام کی توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ تو اہلِ نظر کو اتنی مایوسی ہوئی کہ خود اس نظرئے کی صداقت کے متعلق بھی شبہات بیدار ہونے لگے — اقبال دورِ حاضر کی بربریت اور درندگی کے ہولناک مناظر دیکھ کر چیخ اٹھا کہ :-

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنھیں — خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے

متاعِ معنی بیگانہ از دو دل طلب کہ نگاہِ جوئی — زموراں شوخی طبعِ سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کارے شو — کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

رجعت قہقری کی ایسی مثال شاید ہی اور کہیں مل سکے۔ اقبال کے خلاف یہ عام شکایت ہے کہ وہ حال یا مستقبل کی بجائے ماضی کا ثنا خواں ہے وہ گزشتہ تاریخ کو دہرا کر قوم کو پھر سے وہیں لے جانا چاہتا ہے۔ جہاں سے یہ قافلہ چودہ سو سال پہلے چلا تھا۔

اس رجعت پسندی کی ایک نفسیاتی وجہ بھی ہے۔ اقبال، مشرق کی اکثر چیزوں کا احترام کرتا ہے۔ مذہب کے ساتھ اس کی وابستگی حد درجہ گہری ہے۔ مسلمان سلطان کو ہمیشہ ظل اللہ کہتے چلے آئے ہیں اور ہر بادشاہ کو اعلیٰ حضرت کہہ کر خطاب کرتے رہے ہیں۔ اس بدعت کی ابتدا شاہ پرست علماء سے ہوئی۔ جنھوں نے جمہور کو مرعوب کرنے کے لئے بادشاہوں کو خدا کا سایہ قرار دیا۔ اگر اقبال کی نفسیات کا بہ دقت نظر مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ عوام کا نمایندہ ہونے کے باوجود وہ شاہ پرست اور شاہانہ جاہ و جلال کا پرستار ہے۔ وہ سلاطین کو خدا کا سایہ جانتا۔ اور انھیں اعلیٰ حضرت کے جلیل القدر خطاب سے مخاطب کرتا ہے۔ اورنگ زیب کو وہ مجدد اور اسلامی ترکش کا آخری تیر شمار کرتے ہوئے اس کی برادر کشی، پدر آزاری اور اسی نوع کی اور مصلحت نااندیشیوں کو یک قلم بھول جاتا ہے — یہ اسی عقیدت مندی کا نتیجہ تھا کہ اس نے پیامِ مشرق جیسی زندۂ جاوید کتاب کو امیر امان اللہ خاں کے نام معنون کر کے اس کی شان میں مندرجہ ذیل اشعار کہے جن کا وہ کسی طرح بھی مستحق نہیں تھا :-

چشم تو از پردگی ہا محرم است — دل میان سینہ ات جام جم است

عزم تو پایندہ چوں کہسار تو — حزم تو آساں کند دشوار تو
ہمت تو چوں خیال من بلند — ملتِ صد پارہ را شیرازہ بند
دیدۂ اے خسرو کیواں جناب — آفتابِ ما توارت بالحجاب
اے ترا فطرت ضمیر پاک داد — از غمِ دیں سینۂ صد چاک داد

نادر شاہ درانی، سابق شاہ افغانستان نے ایک دفعہ اقبال، سید سلیمان اور ڈاکٹر راس مسعود کو کابل آنے کی دعوت دی تھی۔ اس موقعہ پر بادشاہ نے اقبال کو علیحدگی میں ملاقات کا موقعہ دیا۔ اس کی کیفیت خود شاعر کی زبانی سنئے۔ اور مدحیہ اشعار پر غور فرمایئے:۔

قصرِ سلطانی کہ نامش دل کشا است — زائراں را گرد راہش کیمیا ست
شاہ را دیدم دراں کاخ بلند — پیشِ سلطانے فقیرے دردمند
من حضورِ آں شہِ والا گہر — بے نوا مردے بہ دربارِ عمر
جانم از سوزِ کلامش در گداز — دست او بوسیدم از راہِ نیاز
خاکی و از نوریاں پاکیزہ تر — از مقامِ فقر و شاہی باخبر

اس دوران میں نادر شاہ کو عبدالخالق نامی طالب علم نے ایک تقریب پر قتل کر دیا۔ "مسافر" کے دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

عہدِ صدیق از جمالش تازہ شد — عہدِ فاروق از جلالش تازہ شد
از غمِ دیں در دلش چوں لالہ داغ — در شب خاور وجود او چراغ

اس نظم کے پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر اقبال بھی پچھلے زمانہ میں پیدا ہوا ہوتا تو یقیناً اس کے یہاں بھی غیر مستحق بادشاہوں کی مدح سرائی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ ان اشعار میں جو منظر بیان کیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ وہ سین ہے۔ جب مشرق کا یہ مفکرِ اعظم نادر شاہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہے تو

وائے گر پس امروز بود فردائے

اقبال کی اس ذہنی کیفیت کو ان کی اقتصادی بدحالی نے زیادہ اُبھارا وہ فکرِ معاش کے ہاتھوں ہمیشہ پریشان رہے۔ آخر عمر میں رسول کریم کے روضۂ مبارکہ کی زیارت کا شوق جنوں کی حد تک پہونچ گیا تھا۔ لیکن زادِ راہ کی کمی کی وجہ سے یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر راس مسعود، والی بھوپال کی سرکار میں ملازم تھے۔ اقبال سے ان کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے، چنانچہ ان کی سفارش سے دوبار بھوپال نے اقبال کو -/۵۰۰ سی روپے ماہوار بطور وظیفہ دینا منظور کر لیا۔ اقبال اس "بندہ نوازی" سے اتنے مسرور ہوئے۔ کہ اس فرمان کو جو انگریزی میں تھا۔ فریم کرا کر رکھ دیا، تاکہ آنے جانے والے اس کا مطالعہ کر سکیں، انھوں نے ضربِ کلیم، نواب حمید اللہ خاں کے نام پر معنون انھیں اعلیٰ حضرت کے بھاری بھرکم الفاظ سے مخاطب کیا اور ان کی مدح میں اس حد تک غلو سے کام لیا کہ :۔

تو صاحب نظری آنچہ در ضمیر من است — دل تو بیند و اندیشۂ تو می دارد

اشتراکیت اب اشتراکیت کو لیجئے :۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ مختلف طبقوں کے اشتراکِ عمل سے معاشرے کو ایسے سانچے میں ڈھالا جائے کہ دولت کی تقسیم مساوی ہو۔ اس نظرئے کی جاذبیت سے انکار نہیں۔ لیکن یہ تجربہ کامیاب ہو سکتا ہے؟ یہ فیصلہ بہت دشوار ہے۔

آغاز اسلام میں بلاشبہ اسلامی معاشرہ اس طرح کے سانچے میں ڈھل چلا تھا۔ اور یہ حالات کم و بیش خلافت راشدہ کے اختتام تک رہے مہاجرین مکہ کے ساتھ انصار کے حسنِ سلوک کی مثال تاریخ عالم آج تک نہ دہرا سکی، ہر چند اسلامی خلافت بہت وسیع تھی، لیکن دولت کی تقسیم ایسی کہ اہل ثروت کو زکوٰۃ اور صدقہ قبول کرنے والا کوئی نہ ملتا تھا۔ اقبال اسی تمدن کی طرف دعوتِ فکر دیتا ہے۔

بلاشبہ اسلامی معاشرے کے اس دور کی حیثیت معیاری ہے۔ لیکن اس کا اتنی جلدی مٹ جانا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ انسانی سوسائٹی میں اس نظام کا کوئی مقام نہیں تھا۔ جب ہم اس عہد کا ذکر کرتے ہیں تو قومی افتخار کی گردن تن جاتی ہے۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر قوم کا معاشرہ جغرافیائی اور تاریخی اور اقتصادی حالات کی پیداوار ہوتا ہے، اس وقت ملک کی آبادی چند لاکھ نفوس سے زیادہ نہ تھی۔ ضروریات زندگی مختصر اور رہائش زاہدانہ تھی۔ جب اسی سوسائٹی کو اقوام عالم سے واسطہ پڑا۔ طور طریقے بدل گئے۔ جھونپڑیوں کی جگہ محلات، کھدر کی جگہ ریشم اور پانی کی جگہ شراب نے لے لی۔ اور وہی سماں نظر آنے لگا، جو دولت و ثروت کا منطقی نتیجہ ہے۔

ہٹلر نے بھی اپنے زمانۂ اقتدار میں ایک ایسے ہی مثالی معاشرے کے قیام کی کوشش کی تھی، جس کا نام قومی اشتراکیت تھا، غریبوں کے لئے حکومت گرم کپڑوں، روپوں اور باقی ضروریات کی فراہمی کا اپیل کرتی۔ اور امرا بڑی فیاضی سے اس کار ثواب میں حصہ لیتے۔ لیکن اس وقتی کامیابی کی وجہ اس نظام کی معقولیت نہیں تھی۔ بلکہ خود ہٹلر کی ہر دل عزیزی، نازی پارٹی کا اقتدار اور سب سے زیادہ روس کی ہمسائگی تھی۔ اقبال، اس نظام کو دنیا پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ پیام مشرق میں امیر امان اللہ خاں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:۔

اے ترا فطرت ضمیر پاک داد — از غم دیں سینۂ صد چاک داد
تازہ کن آئین صدیق و عمر — چوں صبا بر لالۂ صحرا گزر
سروری در دین ما خدمت گری است — عدل فاروقی و فقر حیدری است
در قبائے خسروی درویش زی، — دیدہ بیدار و خدا اندیش زی
آں مسلماناں کہ میری کردہ اند — در شہنشاہی فقیری کردہ اند

اقبال نے روحی کی رفاقت میں فلک مریخ پر مرغدین نامی ایک شہر دیکھا۔ جس کی کیفیت اسی کی زبانی سنئے۔ اگر اسلامی اشتراکیت سے شاعر کا مقصد ایسا نظام معاشرہ ہے۔ تو قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ واقعات کی دنیا میں اس کی حیثیت افلاطون کی خیالی جمہوریت سے زیادہ نہیں، کیونکہ جس ملک کے باشندے شیریں سخن اور پاکیزہ رو ہوں، جہاں علمی اور فنی تحقیقات کے سوا اور کوئی پیشہ نہ ہو۔ جہاں سونے چاندی کے سکے نہ ہوں۔ جہاں کے زمینداروں اور کسانوں میں کوئی امر مابہ النزاع نہ ہو۔ جہاں لوگوں میں کشت و خون اور جنگ و جدال نہ ہوتا ہو جہاں کھانے پینے کی بہتات اور دولت کی افراط ہو۔ ایک ایسی تمنا ہے جو کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی۔

مرغدین و آں عمارات بلند، — من چہ گویم زاں مقام ارجمند
ساکنانش در سخن شیریں چو نوش — خوب روئے و نرم خو و سادہ پوش
خدمت آمد مقصد علم و ہنر — کارہا را کس نمی سنجد بہ زر
کس ز دینار و درم آگاہ نیست — ایں بتاں را در حرمہا راہ نیست
بر طبیعت دیو ماشیں چیرہ نیست — آسمانہا از دخانہا تیرہ نیست
سخت کش دہقاں چراغش روشن است — از نہاب دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاع آبجوست — حاملش بے شرکت غیرے ازوست
اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں — نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے بہ بازاراں زبے کاراں خروش — نے صدا ہائے گدایاں درد گوش

اشتمالیت پچھلے چودہ سو سال کے عرصہ میں نظام سرمایہ داری کے خلاف کوئی معمولی سی تحریک بھی بروئے کار نہ آسکی۔ اگرچہ اسلام سرمایہ داری اور اشتراکیت کا نہایت موزوں امتزاج تھا۔ لیکن فاروق اعظم کے بعد دولت پرستی پھر اسلامی معاشرے میں دخیل ہو گئی تھی اور خلافت راشدہ کے بعد جس قدر حکومتیں قایم ہوئیں۔ اکثر و بیشتر عجمی اور غیر اسلامی تہذیب کا بروز تھیں۔ چنانچہ

عوام کی حالت میں قطعاً کوئی خوشگوار تبدیلی نہ ہوسکی - آخر اُنیسویں صدی کے وسط میں انسانیت کا وہ مربی اعظم پیدا ہوا - جسے دُنیا کارل مارکس کے نام سے یاد کرتی ہے - اس جلیل القدر فلسفی کے نظریات سے یورپ کے ایوانوں میں زلزلہ آگیا اور اشتمالی حکومت کے تصور ہی سے اپنوں بیگانوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی -

انھیں دنوں اقبال نے خضر راہ لکھی - اور حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ میں پڑھی - غلام آباد ہند میں یہ پہلی آواز تھی جو سرمایہ دار طبقہ کے خلاف اُٹھائی گئی - سوا معدودے چند افراد کے سارا برصغیر سرمایہ داری کے ہاتھوں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا - اندھیرے میں اس حیرت انگیز صبح کا تصور بھی دشوار تھا - اس سلسلہ میں اقبال کی بصیرت وہ کچھ دیکھ رہی تھی، جسے الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا - آخر جب اس نے اُفقِ مشرق سے اس صبح بات کو طلوع ہوتے دیکھا - اسے اتنی مسرت ہوئی گویا کسی نے سورج اور چاند اس کی ہتھیلی پر رکھ دئے ہوں - چنانچہ خضر کی زبانی بندۂ مزدور کو یہ خوش آیند پیغام یوں سناتا ہے :-

اُٹھ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اقبال کسی دولتمند خاندان کا فرد نہ تھا، اس کا باپ معمولی کلاہ فروش تھا - دن رات دوکان پر بیٹھتا ہوگا تو پیٹ کا دھندا چلتا ہوگا - وہ لڑکے بھی اقبال کے ساتھ پڑھتے ہوں گے، جن کا لاکھوں روپیہ کا بیوپار ہوگا - محلات اور کوٹھیاں ہوں گی - دولت کی ریل پیل اور نوکروں چاکروں کی چہل پہل ہوگی - طبیعت حساس پائی تھی - کڑھتا ہوگا - پیچ و تاب کھاتا ہوگا - حکومت انگریز کے ہاتھ میں تھی، تو ذرائع دولت ہندو کی اجارہ داری میں تھے - سمجھ گیا کہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر چارہ نہیں - گورنمنٹ کالج سے فلسفہ کا ایم - اے کیا - چونکہ شعر و سخن سے خداداد مناسبت تھی - اس لئے مجالسِ مشاعرہ کے طفیل عوام سے روشناس ہوچکا تھا - اسی اثنا میں خوبیٔ قسمت سے اسے حکومت کی طرف سے اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ مل گیا اور ولایت جانکلا - یہ ان دنوں کی بات ہے - جب ولایت سے پاٹ کر آنے والوں کی کایا پلٹ ہوجاتی تھی - خدا جانے اقبال نے اس دوران میں جاہ و جلال کے کتنے سنہرے خواب اور شان و شوکت کے کتنے ہوائی قلعے تعمیر کئے ہوں گے - واپس لوٹا ہوگا - تو کوٹھیوں کے خوشنما نقشے اور بیش قیمت کاروں کے بیسیوں ماڈل پسند کئے ہوں گے - چنانچہ یہی وجہ تھی کہ گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری سے استعفا دیکر چیف کورٹ کے بار روم میں جا بیٹھا - سو ہوگا، ابھی کوئی دن جاتا ہے کہ میرا شمار بھی صوبے کے قابل ترین بیرسٹروں سے ہونے لگے گا - ہزاروں لاکھوں کماؤں گا، خود کھاؤں گا - اوروں کو کھلاؤں گا - لیکن چند دن کے بعد ہی اس سراب کی حقیقت کھل گئی اور معلوم ہوگیا کہ اس پیشے میں اس کے لئے ترقی کی قطعاً گنجائش نہیں مقدمے جیتنے کے لئے جو پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں اور واقعات کے خدوخال کو جس طرح مسخ کرنا پڑتا ہے - اقبال اس تراش خراش کے لئے فطرتاً ناموزوں تھا لیکن آدمی تھا وضعدار پاس وضع نے ہلنے نہ دیا اور بقول شخصے :-

مردِ غیرت مند تھا، غیرت سے بل کھاتا رہا

ناکامی کا یہ دوسرا گھاؤ تھا، جس نے زخم اول کی سُرخی کو اور گہرا کردیا - چنانچہ ان ناکامیوں سے اس کے جذبات میں اتنی تلخی پیدا ہوگئی کہ دربار خداوندی میں بھی جہاں بڑے بڑے انبیاء دم نہیں مار سکتے، اس سے خاموش نہ رہا گیا :-

یارب یہ جہانِ گزراں خوب ہے لیکن — کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند
گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہو ہاتھ — دُنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند
تو برگِ گیاہے نہ رہی اہلِ خرد را — او کشتِ گل و لالہ بہ بخشد بہ خرے چند

اس حد تک تو چنداں ہرج نہ تھا - بلاشبہ انسانوں کی غارتگری نے کثیر التعداد لوگوں کو دُنیا کی معمولی معمولی مسرتوں سے محروم کر رکھا ہے لیکن اقبال نے یہیں تک اکتفا نہ کی - اس کی رائے میں چونکہ خیر و شر اور نیک و بد بھی خداوند کے قبضۂ اختیار میں ہے - اسی لئے ہماری بدبختیوں کی ذمہ داری بھی اسی پر ہے چنانچہ کہتا ہے :-

تیری مینا میں مے باقی نہیں ہے — بتا کیا تو میرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم، — بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

ان اشعار کے پس منظر میں جو تلخی پیدا پائی جاتی ہے۔ وہ براہِ راست ان مایوسیوں کا نتیجہ ہے جن کا اوپر ذکر ہوا۔

فرائڈ نے جنسی خواہش کو بڑی اہمیت دی۔ اس کی ہمہ گیری سے انکار نہیں۔ لیکن ہماری زندگی میں اس کا نمبر دوسرا ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی کھانے کو مانگتا ہے۔ اگر جنسی بھوک سے لاشعور میں ایسے اوہام بس جاتے ہیں۔ جو قوائے ذہنی کی مناسب نشوونما نہیں ہونے دیتے تو ناداری کے ہاتھوں احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے۔ اور لطیف جذبات مٹ جاتے ہیں۔ اقبال کی مالی حالت معمولی تھی۔ جتنا ذہین تھا، اس سے کہیں زیادہ حساس تھا۔ نامساعد حالات کے بدلنے کی ہر کوشش میں ناکام رہا۔ پروفیسری چھوڑ بیرسٹری اختیار کی تھی۔ لیکن حالت بدتر ہو گئی ولایت کے قیام نے اس احساس کو اور تیز کر دیا۔ جدھر نظر اُٹھا کر دیکھتا۔ سیم و زر کی چمک نگاہوں کو خیرہ کئے دیتی تھی۔ اپنی حالت پر نگاہ ڈالتا، تو ڈھاک کے وہی تین پات۔ حکومت انگریز کے ہاتھ میں تھی۔ تو دولت کے تمام ذرائع پر ہندو قابض تھا۔ اپنی بدحالی سے شکستہ خاطر تو تھا ہی، قوم کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر پھوٹ بہا۔ حمایت الاسلام لاہور کا سالانہ اجلاس ہوا، وہاں چندے کی سب سے بڑی مد یتیم تھے اقبال نے "نالۂ یتیم" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی۔ اہلِ ثروت نے دل کھول کر چندہ دیا، حاضرین نے واہ واہ کے شور سے آسمان سر پر اُٹھا لیا لیکن شاعر کے دل کو کسی نے ٹٹول کر نہ دیکھا۔ یہ نوحہ اس کی ذاتی مصیبتوں کی روداد تھی۔

آشنائے من ز من بیگانہ رفت — از خمستانم تہی پیمانہ رفت،
کم نظر بے تابیِ جانم ندید — آشکارا دید و پنہانم ندید
لالہ و گل از نوایم بے نصیب — طائرم در گلستانِ خود غریب

انجمن کا اجلاس ہر سال ہوتا تھا۔ اگلے سال پھر اقبال کو دعوت شرکت دی گئی۔ شاعر نے فریادِ اُمت پڑھ کر سنائی۔ نظم کیا تھی، دربارِ رسالت میں ستم زدہ امت کا دُکھڑا تھا۔ بے رخی کا گلہ تھا۔ کوتاہیوں کا اقرار تھا۔ غفلت پر ندامت تھی۔ توبہ اور استغفار کا ورد تھا۔ التجا اور استدعا کی گردان تھی۔ مگر حیف کہ ہر دعا نامقبول اور ہر دوا بے اثر ثابت ہوئی۔ منزلِ مقصود دور تر اور طائرِ مراد وحشی تر ہوتا گیا۔

بالآخر لاہور کے در و دیوار اس معرکۃ الآرا نظم سے گونج اُٹھے۔ جسے شکوہ کہتے ہیں اور یہ نظم اس میں شک نہیں محض اقبال کی ذاتی نارسائیوں اور ناکامیوں کے احساس سے وجود میں آئی۔

کہتے ہیں بے سروسامانی نظریۂ اشتمالیت کی سب سے بڑی منادی ہے۔ جہاں بھوک اور ناداری ہے، عوام کو روٹی ملتی ہے نہ کپڑا۔ معیارِ زندگی پست تر ہوتا جا رہا ہے۔ وہاں اس بیج کے لئے خود بخود طیار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ وہ زمانہ تھا جب اشتمالیت کا عروج تھا۔ روس کے اٹھارہ کروڑ انسانوں کی دنیا بدل گئی تھی۔ امیر اور غریب، گدا اور بادشاہ کی تفریق مٹ گئی تھی۔ اقبال نے مثالی حکومت کا جو ذہنی خاکہ طیار کیا تھا۔ اس کا ٹھوس نمونہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ چنانچہ جاوید نامہ میں لینن روسیہ سے خطاب کرتے ہوئے ان کی کوششوں کو یوں سراہتا ہے۔

تو کہ طرحِ دیگر انداختی — دل ز دستورِ کہن پرداختی
ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں — قیصریت را شکستی استخواں
تا برافروزی چراغے در ضمیر — عبرتے از سرگزشتِ ما بگیر،
پائے خود محکم گزار اندر رکاب — گرد این لات و ہبل دیگر مگرد

گو ذہنی طور پر اقبال کمیونزم کے پروگرام سے مطمئن تھا۔ لیکن لادینی کا کانٹا دل میں کھٹکتا تھا۔ اس کے خیال میں حکومت اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

کردہ ام اندر مقامات نگاہ — لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ

نکتۂ مے گویم از مردانِ حال — امتان را لا جلال ۔ الا جمال
ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون — حرکت از لا زاید از الا سکون
در جہاں آغاز کار از حرفِ لا ست — ایں نخستین منزلِ مردِ خدا ست

چونکہ اقبال کے خیال میں صرف یہی نظام اہلِ مشرق کی نجات کا کفیل ہے۔ اس لئے وہ روس کی لادینی کی جس سے مذہب پرست عوام کو نفرت ہے۔ یوں توجیہ کرتا ہے " اہلِ مشرق تم روس کی لادینیت سے دل برداشتہ مت ہو۔ بعض اوقات لوگ جوشِ کردار میں واجبی حدود سے گزر جاتے ہیں۔ اہلِ روس بھی یہی غلطی کر بیٹھے ہیں، جلدی ہی انھیں اس غلطی کا احساس ہوگا اور جب پھر مذہب کی طرف رجوع کریں گے تو سوا اسلام کے اور کوئی دوسرا مذہب انھیں لبھا نہیں سکے گا۔"

چنانچہ کہتا ہے :-

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں، — خویشتن را زیں تند باد آرد بروں
در مقامِ لا نیا ساید حیات — سوئے الا مے خراید کائنات
لا و الا ساز برگِ امتاں — نفیِ بے اثبات مرگِ امتاں
در محبت نخجتہ کے گردد خلیل — تا نگردد لا سوئے الا دلیل
ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لا ست — جملہ موجودات را فرماں رواست

اقبال مفکرینِ عالم کو جس اسلام کی طرف بلاتا ہے۔ یقیناً وہ ملا کا اسلام نہیں۔ جس میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج تو ہیں لیکن روحِ اسلام ناپید ہے :-

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ، قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں، تو باقی نہیں ہے

چونکہ اشتمالیت نہایت سرعت سے پھیل رہی ہے۔ اور عوام میں ہر دل عزیز ہو رہی ہے۔ اس لئے انسانیت دشمن جماعتیں اور ان کے کارکن پریشان ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں ابلیس کی ایک مجلسِ شوریٰ کے مذاکرات کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے ابلیس کہتا ہے :-

یہ عناصر کا پرانا کھیل، یہ دنیائے دوں — ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں،
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز — جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نون
میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب — میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا — میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

جسکی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس شاخِ کہن کو سرنگوں

یہ سن کر ابلیس کا ایک مشیر کمیونزم کی روز افزوں ترقی سے پریشان ہو کر کہتا ہے :-

" یہ درست ہے کہ فرنگی جمہوریت نے ملوکیت کے اوصاف اپنا لئے ہیں۔ اور آزادیِ جمہور کا خواب پریشاں ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن کارل مارکس کی شرارت کا انسداد کیسے ہوگا؟۔ اگر یہی حالت رہی تو دنیا سرمایہ داری کا طوقِ گردن سے اتار پھینکے گی، ہماری کوششیں رائگاں جائیں گی۔

رہے سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب — ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب

وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب — نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب
اس سے بڑھکر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد — توڑدی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

اسی مجلس میں ایک مشیر کہتا ہے :-

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام — اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار
وہ یہودی فتنہ گر وہ روح مزدک کا بروز — ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسر شاہین و چرغ — کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاج روزگار
فتنۂ فردا ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج — کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

کارل مارکس کو اقبال اس محیر العقول نظریہ کی بنا پر کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب کہکر مخاطب کرتا ہے اور "سرمایہ" کو آسمانی کتابوں کا ہم پلہ سمجھتا ہے۔ حق یہ ہے کہ کارل مارکس اپنے حیرت انگیز نظرئے کی وجہ سے اس سے بھی بلند تر مقام کا حقدار ہے اور مشرق کے اس مفکر اعظم نے جس عزت سے اسے یاد کیا ہے۔ وہ اقبال ایسے قدر شناس سے بعید نہیں تھا۔

اقبال کے نظرئے اور روس کی کمیونزم میں صرف یہ فرق ہے کہ وہ مذہبی اقدار کا قایل ہے اور روس میں مذہبی تبلیغ کی اجازت نہیں۔ لیکن جیسا ہم پہلے کہ آئے ہیں۔ جس مذہب کی اجازت نہیں۔ اس سے مراد ظاہری رسوم ہیں اور رسوم کی ضرورت نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ مذہب کی حقیقی روح و متاع گراں بہا ہے۔ جس کی وہاں ضرورت ہے۔ تو یہاں بھی۔ ابلیس، اسلام کی اسی روح سے لرزاں ہے اور اسی سے مسلمانوں کو بے خبر رکھنا چاہتا ہے۔ ورنہ رسوم اسلام پر تو کم و بیش ہر جگہ عمل ہو رہا ہے :-

عہد حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں،
الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر — حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشیں

نفسیاتی طور پر اقبال کو اشتمالیت سے اس لئے ہمدردی ہے کہ عوام کی بھلائی میں اس کی اپنی بھلائی بھی ہے۔

ان دنوں برصغیر میں انگریز کا طوطی بول رہا تھا۔ جس سے اقبال نہ صرف اس لئے بیزار تھا کہ مسلمانان ہند کی اقتصادی بدحالی کی ذمہ داری براہ راست اس پر تھی۔ بلکہ اس لئے بھی کہ گزشتہ دو صدی سے مسلم حکومتیں اس کی زد میں تھیں اور ایک ایک کر کے مٹتی جا رہی تھیں۔ ہندوستان کے علاوہ ایران، افغانستان، عراق، عرب، مصر اور فلسطین سبھی کی ثقافت کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔ اس لئے اسے فرنگستان سے حد درجہ نفرت ہے اور اس کی تہذیب کو انسانیت کی اقدار اعلیٰ کے لئے زہر ہلاہل سے کم نہیں سمجھتا۔ چنانچہ زبور عجم میں کہتا ہے :-

فریاد ز افرنگ و دلاویزی افرنگ — فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ ویرانۂ چنگیزی افرنگ — معمار حرم باز بہ تعمیر حرم خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

اقبال قدرت سے کچھ اس لئے بھی برہم ہے کہ جب مال و دولت کے لا انتہا خزانے اس کی تحویل میں ہیں۔ تو کیوں 'مرد خردمند' کو "برگ گیاہ" سے نہیں نوازتی۔ پھر سوء اتفاق سے حکومت ایسی قوم کے ہاتھ میں دیدی ہے۔ جو خست اور دون طبعی میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ اسی پر بس نہیں۔ بلکہ اقتصادی ناسازگاری نے اسے زردار طبقے سے اتنا متنفر کر دیا تھا کہ سرمایہ داری کی کوئی صورت بھی اسے گوارا نہیں تھی۔ چنانچہ ساقی نامہ میں اہل عالم کو ایک نئے دور کی نوید دیتے ہوئے کہتا ہے :-

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش راز فرنگ — کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

غلامی کی بدترین قسم ذہنی غلامی ہے۔ جس کی گرفت روز بروز سخت تر ہوتی جارہی ہے۔ ایشیا کے کی اقتصادی حالت ایسی ناگفتہ بہ ہے کہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کس ڈھٹائی سے زندگی کو فریب دئے جارہا ہے۔ ان کی کمائی کا معتدبہ حصہ تو زمیندار لے جاتا ہے۔ جو بچتا ہے وہ پیروں کی نذر ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اقبال خود اسی خانہ ویرانداز کی زبان سے اصل واقعات کے گھناؤنے چہرے سے یوں پردہ اٹھاتا ہے :-

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی — گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ — مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن،
نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا — ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کا نشیمن

روس کے اٹھارہ کروڑ انسان لینن کی رہنمائی میں رہزن سرمایہ داروں کے ہاتھ سے نجات پاچکے تھے۔ یہ تبدیلی اس عظیم الشان انقلاب کا پیش خیمہ تھی۔ جس کی نقابت کے فرایض اقبال تیس برس تک سرانجام دیتا رہا۔ اس تبدیلی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے اقبال ایک ایسا مکمل انقلاب چاہتا تھا کہ سرمایہ داری نظام کی اینٹ سے اینٹ بج جائے۔ کیونکہ مظلوم انسانیت میں مزید برداشت کی تاب نہیں رہی تھی۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب — از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

شیخ شہر از رشتۂ تسبیح صد مومن بدام — کافرانِ سادہ دل را برہمن زنار تاب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن — اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

دنیا میں جو انقلاب بھی آیا، مار دھاڑ اور قتل و غارت کے بغیر کامیاب نہ ہوسکا، روس کا انقلاب لینن کی کوششوں کا مرہون ہے۔ جو صلح و آشتی سے دنیا میں انقلاب لانا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب تک زندہ رہا۔ اس کی کوششیں امن پسندانہ انقلاب پر مرکوز رہیں۔ مگر روسی انقلابیوں میں ایک جماعت ایسی بھی تھی۔ جو جبر و تشدد کی قایل تھی۔ تاکہ انسانیت سرمایہ داری کے مظالم سے جلد تر نجات پاسکے۔ اقبال بھی اسی تشدد پسند انقلابی جماعت کا فرد ہے۔ چنانچہ دربارِ خداوندی سے فرشتوں کے نام جو فرمان صادر ہوتا ہے۔ وہ عین بین اسی گروہ کے پروگرام کی نقل ہے :-

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو،
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ضربِ کلیم ۱۹۳۶ء میں چھپی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اقبال کی صحت جواب دے چکی تھی۔ اقتصادی پریشانیوں نے جذبات میں برہمی پیدا کردی تھی

اور جسمانی عوارض نے اس تلخی کو دو آتشہ بنا دیا تھا۔ علاوہ ازیں وہ نطشے کی شخصیت اور اس کی تحریرات بالخصوص "ماورائے خیر و شر" سے غیر شعوری طور پر بہت متاثر تھا۔ چنانچہ اس نے بھی ضربِ کلیم میں تہذیب حاضر کی ہر قدر کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا۔ جو نطشے نے "ماوراء خیر و شر" میں فرنگی متاع فکر و نظر کے ساتھ روا رکھا تھا اور اقبال کی برہمی ایک ایسی ترشروئی میں تبدیل ہوگئی تھی جو زیادہ انتقام کی خواہاں تھی اور اقبال کی اس ترشروئی کا سرچشمہ وہ مایوسیاں اور ناکامیاں تھیں جنھوں نے اس سے نہ صرف کارل مارکس کے نظریہ کی تائید کرائی، بلکہ اشتمالیت کے اس کیمپ میں لا کھڑا کیا جو دولت کی مساوی تقسیم میں تشدد کا قایل ہے۔ جس سے بہت کم لوگ متفق ہو سکتے ہیں۔

مکتبۂ جدید لاہور کی مشہور تاریخی، سوانحی اور نفسیاتی مطبوعات

جو ظاہری و معنوی حیثیتوں سے معیاری درجہ رکھتی ہیں۔ آپ ہندوستان میں ہمارے ذریعہ سے حاصل کر سکتے ہیں، ذیل کی فہرست ملاحظہ فرمائیے اور آپ کو جو کتابیں درکار ہوں ان کی قیمت مع محصول ڈاک ذریعۂ منی آرڈر ہمارے پاس بھیج دیجئے (کمیشن وی پی کا کوئی سوال نہیں) لیکن کوئی آرڈر دس روپے سے کم کا نہ ہونا چاہئے جس کے ساتھ محصول ڈاک بھی بحساب پندرہ فی صدی آپ کو بھیجنا چاہئے۔

منیجر نگار لکھنؤ

سلسلہ تاریخ و سوانح

حیات محمدؐ ---- (محمد حسین ہیکل) ---- اُنیس ۱۹ روپے
ابوبکر صدیق --- (" ") ---- دس ۱۰ روپے
الحسین ---- (" ") ---- ڈھائی روپے
الزہرا ---- (" ") ---- دو ۲ روپے
الہارون ---- (" ") ---- پانچ ۵ روپے
خالد سیف اللہ --- (ابو زید شبلی) ---- پانچ ۵ روپے
عمرو بن العاص --- (حسن ابراہیم حسن) --- پانچ ۵ روپے
چنگیز خاں --- (ہیرلڈ لیمپ) ---- پانچ روپے
امیر تیمور ---- (" ") ---- سات ۷ روپے

سلسلہ نفسیات عملی

جینے کا قرینہ ---- (آندرے موروا) --- چھ ۶ روپے
پریشان ہونا چھوڑئے (ڈیلی کارنیگی) --- چھ ۶ روپے
میٹھے بول میں جادو ہے (" ") --- سات ۷ روپے
جینے کی اہمیت (لین یوتانگ) ---- بارہ ۱۲ روپے

زندگی کا راستہ ---- (یوس ہیٹی جیپر) ---- چھ ۶ روپے
کامیابی کا راستہ ---- (" ") ---- چار ۴ روپے
اپنا راستہ خود بناؤ ---- (خالق کامراں) ---- چار ۴ روپے
کیا آپ کاروبار کرتے ہیں --- (اعجاز حسین) ---- پانچ ۵ روپے

علم و تنقید

ولی سے اقبال تک --- (سید عبداللہ) ---- پانچ ۵ روپے
انسان اور آدمی --- (محمد حسن عسکری) --- چار ۴ روپے
مقدمہ شعر و شاعری --- (ڈاکٹر وحید قریشی) --- دس ۱۰ روپے
تذکرۂ شوق ---- (عطاء اللہ پالوی) --- چھ ۶ روپے
میر حسن اور ان کے خاندان کے شعراء۔ (محمود فاروقی) - پانچ ۵ روپے

منٹو کے افسانے

پھندنے --- (سعادت حسین منٹو) ---- پانچ روپے
گنجے فرشتے --- (" ") --- پانچ روپے
ٹھنڈا گوشت --- (" ") --- تین روپے
چغد ---- (" ") --- تین روپے

اشک رام پوری

(رازِ یزدانی)

نام - صاحبزادہ سید واجد علی خاں عرف اچھن صاحب۔ تخلص اشک ۔ تلمذ۔ حضرت محمود رام پوری جانشین حضرت داغ سے
تاریخ پیدائش اواخر ۱۸۹۱ء (رام پور) تاریخ رحلت :- ۲۸ اگست ۱۹۵۸ء صدر ہسپتال راولپنڈی (پاکستان)
مقام تدفین :- گولڑا ضلع راولپنڈی ۔

خاندان نواب فیض اللہ خاں بانیِ رام پور کے پوتے اور غلام محمد خاں کے بیٹے نواب محمد سعید خاں (۱۸۴۰-۵۵ء) کے دو بیٹے تھے، بڑے بیٹے اور ولی عہد نواب یوسف علی خاں ناظم (۱۸۶۵-۱۹۵۵ء) اور دوسرے نواب زادہ کاظم علی خاں عرف چھوٹے صاحب، انھیں کاظم علی خاں کے بڑے بیٹے صاحبزادہ محمود علی خاں عرف چھٹن صاحب کے اکلوتے بیٹے اچھن صاحب تھے ۔ چھٹن صاحب کی پہلی شادی خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کی دختر سے ہوئی تھی لیکن وہ لاولد انتقال کر گئیں تو دوسری شادی نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کی دختر سے ہوئی اور ان کے بطن سے اچھن صاحب پیدا ہوئے گویا اچھن صاحب نواب ناظم کے نواسے اور نواب زادہ کاظم علی خاں کے پوتے تھے ۔

تعلیم ہوش سنبھالنے کے بعد اچھن صاحب کو اعظم الدین میموریل ہائی اسکول میں داخل کر دیا گیا اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر اس زمانہ میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم تھے جو اچھن صاحب کے اتالیق یعنی پرائیوٹ ٹیوٹر بھی تھے ۔
۱۹۱۴ء میں اچھن صاحب رام پور سے فارغ التحصیل ہو کر انجینیرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ چلے گئے ۔ اچھن صاحب کے والد صاحبزادہ چھٹن صاحب مولانا عبدالحق صاحب مرحوم خیر آبادی کے عزیز ترین شاگرد تھے اور گھر پر چھٹن صاحب کی پرائیوٹ تعلیم نے اچھن صاحب میں بھی فلسفہ اور منطق یعنی علوم عقلیہ کا اچھا خاصہ ذوق پیدا کر دیا تھا، یہی وجہ تھی کہ انگلینڈ پہونچ کر انھوں نے اپنا مضمون بدلا اور فلسفہ اور ادبیات کی طرف متوجہ ہو گئے ۔

کچھ ہی دنوں بعد چھٹن صاحب کے تعلقات ریاست سے کشیدہ ہو گئے، تعلیمی وظیفہ بند ہو گیا اور چھٹن صاحب ان کی تعلیم کا بار اٹھانے سے معذور سے نظر آنے لگے ۔ ان حالات کے تحت اچھن صاحب انگلینڈ سے جرمنی چلے گئے اور جرنلزم کو ذریعہ معاش بنا کر برلن یونیورسٹی میں داخلہ لیا جرمنی میں انھوں نے تقریباً چھ سال گزارے تھے کہ مولانا محمد علی مرحوم کو یورپ کا سفر پیش ہوا، اچھن صاحب کی والدہ نے ان سے ملکر اقرار لیا کہ انھیں واپسی میں ساتھ لیتے آئیں، مولانا نے اس وعدہ کو پورا کیا اور انھیں جرمنی سے رام پور لاکر ان کی والدہ مرحومہ کے حوالے کر دیا ۔

وضع قطع میں نے جب اشک مرحوم کو دیکھا ہے تو وہ بالکل مغربی طرز معاشرت کے پابند تھے، لیکن کچھ دن کے بعد شرعی داڑھی ۔ لمبا کرتا اور چھوٹی تہری کا پاجامہ ان کی وضع تھی ۔ رنگ کھلا ہوا۔ قد متوسط سے ذرا نکلتا ہوا، جسم اکہرا اور آنکھ، ناک میں پورا تناسب ۔ انھوں نے نہ شادی کی نہ کوئی اولاد چھوڑی ۔

دیگر حالات اچھن صاحب ۱۹۳۰ء سے ریاست کے حلقۂ ملازمت میں بھی آ گئے تھے اور وہ ریاست میں بڑے بڑے لوگوں کو لانے کا سبب بھی بنے کرنل بشیر حسین زیدی ۔ ریاست کے آخری چیف منسٹر بھی ان ہی کی کوششوں سے رام پور آئے تھے مگر

اچھن صاحب کو اپنے ان دوستوں کی دوستی راس نہ آئی اور آخر میں انھیں سے اختلاف رائے کے سبب ان کو ریاست کی ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔

طبیعت میں سوز و گداز انھیں ورثہ میں ملا تھا کیونکہ ان کے والد معقولی ہونے کے باوجود فقیر دوست اور درویشی پسند ہستیوں میں سے تھے سنا جاتا ہے کہ کیمیا کا بھی انھیں شوق تھا، اچھن صاحب کو کیمیا وغیرہ سے تو کوئی لگاؤ نہ تھا لیکن جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر داڑھی والے بزرگ بنے تو انھوں نے حضرت شاہ غلام محی الدین سجادہ نشین پیر مہر علی شاہ مرحوم) سے تجدید بیعت کر لی اور یہ کشش کچھ ایسی زبردست تھی کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز دور سے پہلے ہی غالباً ۴۶ء میں وہ گولڑا ضلع راولپنڈی اپنے پیر و مرشد کے پاس چلے گئے اور زندگی کے باقی سال وہیں گزار دئے۔

مرض اور رحلت

ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ ان کے پھیپھڑوں میں کنسر ہو گیا ہے۔ بڑے غور و خوض اور بحث کے بعد جمعرات کے دن ۲۸ر اگست ۱۹۵۸ء کو راولپنڈی میں ان کا آپریشن ہوا۔ بارہ بجے سے ساڑھے تین بجے تک آپریشن ہوتا رہا۔ ڈاکٹروں نے اعلان کیا کہ آپریشن کامیاب ہوا اور آٹھ بجے تک ہوش آجائے گا لیکن ابھی آٹھ بجنے میں تین گھنٹے باقی تھے کہ دل کی دھڑکن بند ہو گئی۔

رام پور اور بیرونِ رام پور سے ربط

اچھن صاحب رام پور سے کتنے مربوط تھے اور بیرون رام پور ان کے مراسم کا کیا حال تھا اس کو جاننے کے لئے میں مولوی عبدالسلام خاں صاحب پرنسپل مدرسۃ العالیہ رام پور کے اس مقالے کا ایک حصہ نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو صولت پبلک لائبریری رام پور کی طرف سے یوم اشک کی تقریب میں پڑھا گیا تھا:۔

> رام پور میونسپلٹی کا الکشن در پیش ہے، اور اچھن صاحب کا مکان مشورہ گاہ بنا ہوا ہے، رام پور کی تعلیمی پس ماندگی اور خصوصیت سے اعلیٰ تعلیم کے لئے کسی کالج کا نہ ہونا ہم سب کے لئے دردِ سر بنا ہوا تھا کہ اچھن صاحب کے یہاں کوچنگ کلاسز کے طور پر رام پور اکیڈیمی کا کھنکھٹا پا گیا اور ایف اے - بی اے اور ایم اے تک کی طیاری کرانے کے لئے اعزازی کام کرنے والے بزرگ تلاش کر کے جمع کر لئے گئے۔ مکان حاصل کر لیا گیا۔ اچھن صاحب بھی بے گریباں کا تکمہ دار کرتا اور چپل پہنے مغرب بعد پڑھانے کے لئے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ ترقی پسند نوجوانوں کا اصرار ہے کہ رام پور کے مسایل میں ایم - این رائے سے بھی مدد لی جائے، اچھن صاحب دلی جانے کے لئے طیار کر لئے گئے۔ دلی میں ایم - این - رائے اچھن صاحب پر نظریں جمائے ہوئے ہیں کہ اچھن صاحب لپٹ گئے اور بولے ایں تم ایم - این رائے میں سوچ رہا تھا کہ ذات شریف کون ہوں گے اور کیسے ہوں گے۔
>
> ..... رات کے دس بجے ہیں دو چار خوش ذوق نوجوان ساتھ ہیں اور میاں (اچھن صاحب کو عام طور سے یہاں کہا جاتا تھا) کہیں سڑک پر جا رہے ہیں ... اکبر الہ آبادی کا ظریفانہ کلام بات چیت کا موضوع ہے کہ اچھن صاحب نے فرمایا ان کا سنجیدہ کلام بھی کم با مزہ نہیں اور اب ان کے منتخب سنجیدہ اشعار سناتے چلے جا رہے ہیں کہ منزلِ مقصود آگئی۔
>
> مضطر خیرآبادی پر تبصرہ ہو رہا ہے اور ان کے بہترین اشعار سنا رہے ہیں۔ رام پور کے پڑھے لکھے نوجوان بیٹھے ہیں اور اچھن صاحب پروفیسر براؤن سے متعلق لطیفے بیان کر رہے ہیں۔ اس وقت کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر جانسن اور انکے شاگرد رسل مشہور فلسفی کا اپنے سامنے کا ایک دلچسپ مکالمہ نقل ہو رہا ہے، اقبال کے تذکرے میں بیک نے گرٹ کا تذکرہ آگیا ہے فرما رہے ہیں کہ وہ ہمارے بھی بہت شفیق استاد تھے ہم کہہ رہے ہیں کہ فلاں صاحب آج کہتے تھے کہ انگلستان میں اچھن صاحب تو شاہانہ رہتے تھے اور یونیورسٹی کو ممنون کرنے کے لئے کبھی کبھی کالج بھی آجایا کرتے تھے یہ ضرور تھا کہ وہاں کے پروفیسر اچھن صاحب کا بہت خیال کرتے تھے تو فرمانے لگے تو کیا ہم ان کا خیال کرتے۔
>
> دوپہر کا وقت ہے جامعہ رائے چودھری اکبر علی (مرحوم) آگئے ہیں، چائے پی جا رہی ہے اکبر علی مرحوم انگریزی نظم کے اعلیٰ نمونے اپنے حافظہ کی مدد سے گھنٹہ بھر سنا کے خاموش ہوئے ہیں کہ اچھن صاحب نے انگریزی مختصر نگاری کا تذکرہ کر دیا اور اب انگریزی نثر کے اعلیٰ نمونے نام بنام سنانا شروع کر دئے۔

دوپہر کے کھانے پر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب آئے ہوئے ہیں، اچھن صاحب زنانے میں ہیں باہر ان ہی کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرما رہے ہیں کہ اچھن صاحب ہمارے یہاں کے مصنف بھی تو ہیں، ہم لوگ تعجب کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں انھوں نے اپنے لئے اُنکی منتخب کی تھی اور میں نے اس پر مقدمہ لکھا تھا۔ ہم لوگ پوچھتے ہیں کیا واقعی ان کی کوئی کتاب موجود ہے اور ڈاکٹر صاحب جواب دیتے ہیں۔ "حضرت اندر سے آجائیں تو ان کے سامنے پوچھنا"

کلکتہ یونیورسٹی کی اسلامک اسٹڈی کے شعبہ کے ہیڈ اور ہمارے مدرسۃ العالیہ کے فارغ التحصیل ڈاکٹر زبیری مہمان ہیں اور خواجہ عبدالمجید کے نام کے سلسلہ میں جرمنی کا لطیفہ بیان ہو رہا ہے اور ہم سب لطف لے رہے ہیں۔

ابھی ابھی دروازے پر کار رکی ہے ایک صاحب اچھن، اچھن کہتے ہوئے آئے اور لپٹ گئے اور بات چیت شروع ہوگئی معلوم ہوا کہ یہ ہیں سید حسن صاحب ہندوستان کے سفیر متعین رام پور آئے ہوئے تھے، اچھن صاحب کی والدہ مرحومہ کے انتقال کی خبر سنی اور برائے تعزیت آئے ہیں۔

سیرت محمد علی شایع ہوئی ہے ایک نسخہ کوئی صاحب میاں کے یہاں بھی لے آئے ہیں۔ ورق گردانی ہو رہی ہے کہ مولانا محمد علی کی تصویر سامنے آگئی نیچے لکھا ہوا ہے۔ "تمھارا پرانا استاد نیا دوست اور ہمیشہ کا بھائی محمد علی" کسی نے کہا یہ تصویر تو وہ ہے جو مولانا نے آپ کو دی تھی۔ اچھن صاحب جواب دے رہے ہیں کہ ہاں جامعہ والوں نے مجھ سے لے لی ہے۔

اچھن صاحب بڑے متواضع و منکسر المزاج تھے لیکن چھوٹوں سے اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والوں سے اس آن کے ساتھ ملتے کہ ان کی ساری برتری اور بڑائی کا احساس مجروح ہوجاتا، وہ بڑے لطیفہ سنج، بذلہ گو تھے اور بڑا پاکیزہ ذوق سخن رکھتے تھے۔

ہم نے ہر حال میں اے بانیٔ شر — خیر مانگی ہے خدا سے تیری

یہ شعر بھی انھوں نے مجھے ایک مکتوب میں سرمکتوب کے طور پر لکھا تھا۔ "بانیٔ شر" غالباً یوں کہ میں نے کئی مہینے سے انھیں نہ خط لکھا تھا نہ خط کا جواب دیا تھا۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

سنا ہے کہ پاکستان میں راولپنڈی کیمپ والے کرنل زبیری کے پاس ان کی نوٹ بک ہے جس کو شایع کرنے کا وہ انتظام کر رہے ہیں۔ ادھر رام پور میں صولت پبلک لائبریری نے ان کے کلام کی اشاعت کے انتظام کے لئے کوئی کمیٹی بنادی ہے جو پاکستان سے ان کا کلام حاصل کرکے شایع کرے گی۔

بعض اشعار ملاحظہ ہوں :-

نگاہوں میں اُٹھنے کی طاقت نہیں ہے — اب آجاؤ وقت ندامت نہیں ہے

ہوا خواہی گل کا ثمرہ تو دیکھو، — جھکولے ہی کھاتا رہا آشیانہ

خامیٔ وحشت نہ کر زنداں میں اتنا شرم سار — سر نہیں اٹھتا مرا دیوار و در کے سامنے

ان کی حسرت ہے ابھی ان کی تمنا ہے ابھی — مٹتے مٹتے بھی دل تنگ میں کیا کیا ہے ابھی

اپنی نظروں سے جدا کر نہیں سکتے دم بھر — پاس ان کو دل بیمار کا اتنا ہے ابھی

دل دکھا کے بھی قابل نہ رہا اور اس نے — اک نگاہِ غلط انداز سے دیکھا ہے ابھی

اک دن وہ مل گئے تھے سر رہگزر کہیں — پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

انداز اعتراف محبت تو دیکھئے — میری نظر کہیں ہے تو ان کی نظر کہیں

ان ہمدموں نے اور بگاڑے تمام کام — دل سے بنا بنا کے اِدھر کی اُدھر کہیں

بیٹھے رہوگے دید کا وعدہ لئے ہوئے — بیمارِ غم نے آنکھ نہ کھولی اگر کہیں

ساقیا محتسب نہ صراحی نہ جام ہے — ان کی نگاہ مست کا کیا انتظام ہے

ہر سانس میں ہے موت کا کھٹکا لگا ہوا
گویا قدم قدم پہ مسافر کو شام ہے

بات تاڑی تھی جو ہم نے ترے شرمانے سے
اور بھی جم گئی دل میں وہ قسم کھانے سے

میں نے چکھی تھی کہ ساقی نے کہا جوڑ کے ہاتھ
آپ للّٰلہ چلے جایئے میخانے سے

کسی کافر نے اپنے درد کی دولت عطا کر دی
وگرنہ مجھ خدائی خوار کا مقدور ہی کیا تھا

نگاہوں سے جو غائب ہو گیا کوئی تو ہوش آیا
کہ ان کمبخت ہاتھوں سے وہ دامن دور ہی کیا تھا

مقام شکر ہے مٹی مری عزیز ہوئی
اگر وہ قتل نہ کرتے تو کیا ٹھکانا تھا

جسے سناؤں بجز آپ کے وہ خوب کہے
مرے خیال میں ایسا بھی اک فسانہ تھا

دھڑکا دل اس قدر کہ زباں بند ہو گئی
مشتاق وہ بھی عرضِ تمنا کے رہ گئے

اک وہ کہ خود بلائے گئے بزم ناز میں
اک ہم کہ اپنے آپ کو سمجھا کے رہ گئے

بے رُکے وہ جو ادھر سے گزرے
تیر پر تیر جگر سے گزرے

غمِ دوراں ہی بہت کافی تھا
آپ کیوں میری نظر سے گزرے

رکھ سیلابِ ندامت اے اشکؔ
اک مرے دامن تر سے گزرے

ہو گئی کیا میری حالت دیکھئے
دیکھئے اپنی عنایت دیکھئے

ہائے وہ عالمِ خلوت ترے کاشانے کا
مجھ کو کعبہ کا نہ رکھے گا نہ بتخانے کا

دلِ لطفِ خلش پہ مبتلا ہے
اس درد کی کون سی دوا ہے

دشمن تری بزم سے نکالے
اچھا ہے مری یہی سزا ہے

ہوتی ہے شکایت اس صنم کو
اتنا بھی نہ کہہ مرا خدا ہے

کیا جانئے کیا وطن میں گزری
پردیس میں دل دھڑک رہا ہے

شیخ صاحب کو مبارک حشر میں دوزخ کا ڈر
میں تو رحمت دیکھ کر اس کی پشیماں ہو گیا

ہم اسیروں کے لئے صیاد کیا قیدِ مقام
خون کے آنسو جہاں ٹپکے گلستاں ہو گیا

اشک روتے ہیں دشتِ غربت کو
جب وطن میں قیام ہوتا ہے

جیتے جی محروم کیوں نغمہ سے دل کا ساز ہو
ٹوٹ اے تارِ نفس تو ہی کہ کچھ آواز ہو

حسرتیں اور تباہی میری،
ہائے ناکردہ گناہی میری

وہ سرِ بزم نہ پوچھیں مرا حال،
بات رہ جائے الٰہی میری

اک زمانہ ہو گیا گو شغلِ مے چھوٹے ہوئے
جی بھر آیا دیکھ کر جام و سبو ٹوٹے ہوئے

شیخ جی اپنا تو یہ اسلام ہے
بڑھ کے اس بت سے خدا کا نام ہے

قتل کرنے کو مرے حیلے نہ ڈھونڈھ
تجھ پہ مرنا، یہ بھی تو الزام ہے

کون سے روز ترے وصل کا ساماں نہ ہوا
کون سی رات مجھے موت کا ارماں نہ ہوا

شکوۂ جور سے خود مجھ کو ندامت ہوتی
وہ یہ کہئے کہ وہ شوخ پشیماں نہ ہوا

تعمیرِ ہوش کس کو تاب ہو گی خندۂ گل کی
اگر آئے تو پیغامِ جنوں لے کر بہار آئے

رلاتا اشکؔ کا تم کو بھلا معلوم ہوتا ہے
کہیں ایسا نہ ہو بے ساختہ تم نے پیار آئے

مولانا آزاد ایک مفکر کی حیثیت سے

(پروفیسر رفیع اللہ عنایتی)

اس میں شک نہیں مولانا اس صدی کے بڑے مذہبی عالم، ہندوستان کی تحریک آزادی کے زبردست قاید اور ایک بڑے انشا پرداز کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن اگر ان کی پوری زندگی کو بہ نظر تحقیق دیکھا جائے تو وہ ہم کو بنیادی طور پر مفکر ہی نظر آتے ہیں یہ ضرور ہے کہ گاندھی جی کی طرح مذہب ان کی فکر کا بہت اہم موضوع تھا۔ لیکن تحقیقی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی ساری بنیاد اخلاق پر قایم تھی۔ وہ بڑے غنی انسان تھے اور انھوں نے فلسفہ کو زندگی بنا دیا تھا۔

ہر مفکر روح عصر کا نباض ہوتا ہے، اپنے ماحول سے بغاوت کرکے اس کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے، مولانا سماج کے بہت بڑے ناقد بھی تھے اور اس کے مصلح بھی۔

انھوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ کافی قدامت پسند تھا۔ لیکن ذہنی اور فکری اعتبار سے وہ اس سے مختلف تھے۔ جس میں انھوں نے علم حاصل کیا وہ بھی فرسودہ تھا۔ لیکن ان کا ذہنی میلان بڑا ہی تجدد پسند تھا۔ انھوں نے مذہبیات کا مطالعہ کیا، حکیمانہ افکار کو بہ نظر غایر دیکھا اور انھیں کی مدد سے اپنے نظام فکر کی اساس اخلاقیات پر رکھی۔ اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کو لکھے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میرے افکار کا سرچشمہ مثنوی کے افکار نہیں بلکہ اسلامی صوفیاء کے حکیمانہ افکار ہیں۔ ٹھیک اسی طرح مولانا کے نظام فکر کی بنیاد بھی تصوف کا اخلاقی نظام ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ صوفیوں کے عمل سے متنفر تھے لیکن وہ اخلاقیات کو بڑی اہم جگہ دیتے تھے۔ مولانا کے زمانہ میں مابعد الطبیعیات کا قدیم ڈھانچہ ٹوٹ چکا تھا اور مذہب میں قدر مشترک صرف اخلاقیات ہی رہ گئی تھی اور یہی اخلاقیات گاندھی جی اور مولانا کے افکار کی روح رواں ہے۔ ان کا دل و دماغ بڑا متوازن تھا۔ وہ ایک پہاڑ کی مانند تادم مرگ اپنے اصول پر قایم رہے اور نصف صدی تک ملک کی قیادت کرتے رہے۔ وقت کے سخت سے سخت طوفان گزر گئے اور مخالف آندھیوں کے زبردست جھونکے چلے لیکن ان کے مائے استقامت میں کوئی لغزش نہ پیدا ہو سکی۔

ہمارے سامنے ان کی ساری تحریریں ہیں۔ ان میں تذکرہ، الہلال و البلاغ، غبار خاطر، انڈیا ونس فریڈم، تفسیر، آزادی کے بعد کی تقاریر شامل ہیں۔ ان سب کی روشنی میں ان کے فلسفۂ حیات کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غبار خاطر ان کا شاہکار ہے جس میں تقریباً سارے افکار آگئے ہیں۔ لیکن یہ نتیجہ ہے چالیس سال کی فکری کاوش کا اور اس عملی زندگی کا جس کے ساتھ ساتھ مطالعہ برابر جاری رہا۔

ایک فلسفی میں کیفیت تشکیک بھی پائی جاتی ہے چنانچہ یہ کیفیت مولانا میں بھی تھی۔ ان کا ذہن فلسفہ کے بنیادی سوالات پیدا کرتا تھا اور پھر اپنے ماحول کو نظر میں رکھتے ہوئے وہ اس کے جواب دینے کی کوشش کرتا تھا "زندگی اور حرکت کا یہ کارخانہ کیا اور کیوں ہے؟ اس کی کوئی ابتدا ہے یا نہیں؟ یہ کہیں جاکر ختم بھی ہوگا یا نہیں؟ خود انسان کیا ہے؟ یہ جو ہم سوچ رہے ہیں کہ انسان کیا ہے؟ تو خود یہ سوچ اور سمجھ کیا چیز ہے؟ اور پھر حیرت اور درماندگی کے ان تمام پردوں کے پیچھے کچھ ہے بھی یا نہیں؟" تقریباً اسی قسم کے سوالات ہر مفکر حیات کی طرح مولانا کے ذہن میں بھی پیدا ہوئے اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس کارخانہ قدرت کے پیچھے ایک صاحب ادراک و ارادہ

قوت پس پردہ ضرور موجود ہے۔" اور یہی قوت "خدا" ہے۔ یہاں پہونچ کر وہ انسانی تاریخ کے ارتقاء اور موجودہ نظریات کی مدد سے اپنے خیالات کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔ "انسان کے حیوانی وجود نے مرتبۂ انسانیت میں پہونچ کر نشو و ارتقاء کی تمام پچھلی منزلیں بہت پیچھے چھوڑ دی ہیں، اور بلندی کے ایک ارفع مقام پر پہونچ گیا ہے جو اسے کرۂ ارض کی تمام مخلوقات سے الگ اور ممتاز کر دیتا ہے۔ اب اسے اپنی لامحدود ترقیوں کے لئے ایک لامحدود بلندی کا نصب العین چاہئے جو اسے برابر اوپر کی طرف کھینچتا رہے۔ اس کے اندر بلند سے بلند تر ہوتے رہنے کی طلب ہمیشہ ابلتی رہتی ہے اور اونچی سے اونچی بلندی تک اڑ کر بھی رکنا نہیں چاہتی۔ اس کی نگاہیں ہمیشہ اوپر ہی طرف لگی رہتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لامحدود بلندیوں کا نصب العین کیا ہو سکتا ہے؟ ہمیں بلا تامل تسلیم کر لینا پڑے گا کہ خدا کی ہستی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ہستی اس کے سامنے سے ہٹ جائے تو پھر اس کے لئے اوپر کی طرف دیکھنے کے لئے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ پھر وہ انسانی ارتقاء پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :- "انسان عناصر کے درجہ سے بلند ہو کر نباتاتی زندگی کے درجہ میں آیا۔ نباتات سے بلند ہو کر حیوانی زندگی کے درجہ میں پہونچا پھر حیوانی مرتبہ سے اڑ کر انسانیت کی شاخ بلند پر اپنا آشیانہ بنایا۔" مولانا کے نزدیک اس ساری کائنات میں ایک اصول تخلیق (Creative Principle) کام کر رہا ہے۔ جس کے بغیر کائنات اور سماج کا ارتقاء کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے، مولانا نے اس بات کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

"ہندوستان نے برہما (ذات مطلق) کو ایشور (ذات متصف و مشخص) کی نمود میں دیکھا اور پتھر کی مورتیاں تراش کر سامنے رکھ لیں تاکہ تسکین خاطر ہو سکے۔ یہودیوں نے خدا کو ایک قاہر و جابر شہنشاہ کی صورت میں دیکھا۔ لیکن اسلام نے اپنے عقیدہ کی بنیاد سرتاسر تنزیہہ پر رکھی اور تمثیلوں کے دروازے بند کر دئے۔" مولانا کا یہ نصب العین خالص اسلامی ہے۔ وہ اس کو حدود زمان و مکان سے علیحدہ کر کے دیکھتے ہیں۔

الگزنڈر نے اپنے گلاسگو والے خطبات میں "خدا اور الوہیت" کے عنوان سے جو اب لکھا ہے اس میں صفحہ ۳۴۷ پر لکھتا ہے :-
"گو ذہن انسانی کے نزدیک الوہیت دوسری اعلیٰ تخریبی قوت ہے جسے کائنات عالم وجود میں لانے کی سعی کر رہی ہے۔ لیکن ہم نہیں جانتے کہ وہ قوت کیا ہے۔ ہم اسے محسوس کر سکتے ہیں۔ نہ ہمارا ذہن اسی کے تصور پر قادر ہے۔ انسان ابھی تک ایک نامعلوم خدا کے لئے قربانگاہیں تعمیر کر رہا ہے۔ یہ معلوم کرنا کہ الوہیت کیا چیز ہے۔ اس کا احساس کیا ہوتا ہے، اس صورت میں ممکن ہے کہ ہم خدا بن جائیں۔" اقبال الوہیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے :- "میرا عقیدہ ہے کہ کائنات میں جذبۂ الوہیت جاری و ساری ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قوت ایک اکمل و اعلیٰ انسان کے پیکر خاکی میں ظاہر ہوگی جو وقت کا تابع نہ ہوگا۔" لیکن مولانا کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ نہ تو اس کو ایک جابر خدا کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں اور نہ انسان کامل کے روپ میں اسیر کرنے کے خواہشمند ہیں۔ بلکہ وہ اس کو ایک (Creative Principle) کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔

آگے چل کر وہ قوت فکر و ادراک کی ماہیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مادہ اور جوہر کے رشتہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ اندھی یا بہری قوت نہیں ہے بلکہ یہ اپنے طبعی خواص اور طبعی احوال و ظروف سے ترقی کرتی ہوئی فکر و ادراک کا شعلۂ جوالہ بن گئی ہے۔ لکھتے ہیں :- "اگر یہاں مادہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، تو پھر مرتبۂ انسانی میں ابھرنے والی وہ قوت جسے ہم فکر و ادراک کے نام سے پکارتے ہیں، کیا ہے؟ یہ کیا ہے جو ہم میں یہ جوہر پیدا کر دیتی ہے کہ ہم خود مادہ کی حقیقت میں غور و خوض کرنے لگتے ہیں اور اس پر طرح طرح کے احکام لگاتے ہیں، یہ سچ ہے کہ موجودات کی ہر چیز کی طرح یہ جوہر بھی بہ تدریج اس درجہ تک پہونچا۔ وہ عرصہ تک نباتات میں سوتا رہا، حیوانات میں کروٹ بدلنے لگا اور پھر انسانیت کے مرتبہ میں پہونچ کر جاگ (اٹھا)"۔ مولانا کے نزدیک مادہ اور جوہر دونوں اپنا علیحدہ وجود ہو سکتے ہیں۔

مولانا اس (Creative Principle) کو ہندوستان کی سماج پر منطبق کرتے ہیں۔ اسمتھ نے "اسلام جدید" میں

اقبال پر تنقید کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ " اقبال نے ہمیشہ ان گروپوں اور طاقتوں کی حمایت کی جو سماج کے اور خود اس کے نظریات کے مخالف تھیں - لیکن مولانا نے ہندوستان کی تحریک آزادی کی شروع سے حمایت کی اور انگریزی سامراجیت اور رجعت پسند طاقتوں کی مخالفت کی " انھوں نے الہلال کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد کا پرچار کیا اور زندگی بھر اس بات پر زور دیتے رہے - وہ افراد سے زیادہ سماجی اور اجتماعی بقاء حیات پر زور دیتے ہیں - فروری ۱۹۲۰ء میں صوبائی خلافت کمیٹی بنگال کے جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :- "شریعت نے مسلمانوں کے لئے جہاں انفرادی زندگی کے اعمال مقرر کر دئے ہیں - وہاں اس کے لئے ایک اجتماعی رجحان مقرر کر دیا ہے - وہ کہتی ہے کہ زندگی اجتماع کا نام ہے افراد و اشخاص کوئی شے نہیں " یہاں قوم سے مراد ملتِ مسلم نہیں ہے - بلکہ پوری ہندوستانی قوم کی طرف اشارہ ہے جس میں ہندو اور مسلم دو بڑی (Communities) بستی ہیں - غبار خاطر میں ایک جگہ بڑی خوبی کے ساتھ انھوں نے اپنے تصورِ اجتماعیہ کو حکیمانہ اور فلسفیانہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے :- " ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے - یہاں ہر چہرے کا عکس بہ یک وقت سیکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے اگر ایک چہرے پر بھی غبار آجائے گا تو سیکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے - ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے وہ پورے مجموعہ کا حادثہ ہے " یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد پر پورا پورا زور دیا - دسمبر ۱۹۴۷ء میں اعلان آزادی کے بعد مولانا کی صدارت میں لکھنؤ میں جو اجتماع ہوا اس میں مولانا نے ۱/۴ ۴ کروڑ مسلمانوں کو جن الفاظ میں خطاب کیا وہ اپنی ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے اور جس کو ملک کبھی بھلا نہیں سکتا - " صدیوں کی مشترکہ تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے - ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بیشمار حقیقتیں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترکہ زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو - ہماری بولیاں الگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے - ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا - ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے، مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا - یہ تمام مشترکہ سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی - ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں - اس طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے کہوں گا کہ وہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے - کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی ایسے خیالات الگ نہیں ہو سکتے ---- ہماری اس ہزار برس کی مشترکہ زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے - ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے، وہ قدرت کے محض ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں - اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے اور قسمت کی مُہر اس پر لگ چکی " ایک مقام پر تفسیر القرآن میں لکھتے ہیں :- " علم و نظر کی راہوں میں آج تک قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں - لیکن میرے لئے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں - جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثہ میں ملا اور جو کچھ جدید ہے اس کے لئے میں نے اپنی راہیں خود نکالیں -

مولانا کے نزدیک مذہب، سائنس اور فلسفہ کا ایک ہی مقصد ہے، انھوں نے انسان اور اس کے فہم و ادراک کے ارتقار کو افکارِ جدیدہ کی روشنی میں پیش کیا ہے اور ان کے سارے نظام فکر بنیاد عالمگیر اصول اخلاق پر قایم ہے - اور انھوں نے ہمیشہ عوام کو متحدہ محاذ کی صورت میں جمع ہونے کی دعوت دی اور سامراجیت سے کبھی ہاتھ نہیں ملایا - ۱۹۱۳ء میں کہا تھا :- " قومیت کی روح ہمیشہ افراد کی غفلت میں سوتی ہے - ذہن و دماغ کے تغیرات میں خواب دیکھتی ہے - جذبات کے ہیجان میں کروٹ بدلتی ہے، اور بالآخر جد و جہد کے میدان میں کھڑی ہوتی ہے - جس طرح اس کی کامیابیاں عظیم ہیں اس طرح اس کی رکاوٹیں بھی بے شمار ہیں اور جس طرح اس کی فتحمندی اٹل ہے اس کی مشکلات بھی ناگزیر ہے " پھر کہتے ہیں :- " ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں ایک وقت آتا ہے جبکہ انسانوں کے لئے زندگی کی خواہش معصیت بن جاتی ہے -

اور زندہ رہنے سے بڑھ کر اور کوئی جرم نہیں ہوتا۔ جبکہ درختوں کی ٹہنیوں پر رسیاں لٹکائی جاتی ہیں تاکہ ان میں فرزندان آدم لٹکائے جائیں ۔ یہ وقت آتا ہے اور انقلاب امم کے ایک قدرتی قانون کے تحت گزر جاتا ہے اور پھر بربادی و ہلاکت کا ہر وہ بیج جو زمین میں ڈالا گیا تھا نئے موسم کے شروع ہوتے ہی زندگی اور حیات قایم و دائم کا پھل پیدا کرتا ہے"۔

انھوں نے چالیس سال سے زیادہ اپنے ملک کی قیادت کی۔ اور دوسرے اشتراکی مفکرین کی طرح انھوں نے بھی جمہوری طاقتوں کا ساتھ دیا۔ گاندھی جی اور چیرمین ماؤ کی طرح وہ بھی عوامی طاقتوں کی رہنمائی کرتے رہے اور ان کا مقام ان سب میں کسی سے کم نہیں۔ جتنا زمانہ گزرتا جائے گا ان کی عظمت بڑھتی جائے گی اور جب کبھی کوئی غیر جانبدار محقق ہندوستان کی آزادی کی تاریخ کو ترتیب دینے بیٹھے گا تو اس میں مولانا کا درجہ اور مقام یقیناً بلند ہوگا۔ انھوں نے ہر موقع پر اپنے ملک کی صحیح رہنمائی کی اور ان کی "انڈیا ونس فریڈم" کے پڑھنے سے اس بات کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔

مذاہبِ عالم

اپنی نوعیت کی بالکل پہلی اُردو تصنیف

محمد عبداللہ المسدوسی نے کامل تحقیق و تفتیش کے بعد بتایا ہے کہ اسوقت (۱) دنیا میں مختلف مذاہب کے متبعین کی کتنی حکومتیں کہاں کہاں پائی جاتی ہیں۔ (۲) ان کی آبادی و رقبہ کیا ہے۔ (۳) ان کا سیاسی، اقتصادی و معاشرتی موقف کیا ہے (۴) ان کی پٹرولی دولت کتنی ہے (۵) ان کے استعماری عروج و زوال کی تاریخ کیا ہے۔ (۶) دنیا کے جدید سیاسی معاہدات کی رو سے ان کے باہمی تعلقات کیا ہیں۔ تین باب صرف مسلم حکومتوں کے لئے وقف ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ اسوقت تمام دنیا میں ان کی آبادی کتنی ہے کہاں کہاں ان کی حکومتیں قایم ہیں اور سیاسی و اقتصادی حیثیت سے ان کا کیا مرتبہ ہے۔ چھ سادہ و رنگین نقشوں اور متعدد ضمیموں کے ذریعہ سے ان سب کی جغرافی پوزیشن، تناسب آبادی، اقتصادی ذرایع اور سیاسی اہمیت کو نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب موجودہ عالمی حالات، ان کے بنیادی عوامل اور اسلامی حکومتوں کے موجودہ سیاسی موقف کو سمجھنے کے لئے ایک آخری حیثیت رکھتی ہے۔ نہایت نفیس طباعت و کتابت کے ساتھ بہتر شایقین کا منتظر ہے اور مع محصول تیرہ روپے میں مل سکتی ہے قیمت پیشگی آنا چاہئے۔ ورنہ ہی نہیں بھیجا جائے گا۔ منیجر نگار لکھنؤ

گلہائے پریشاں

آراستہ الیاس احمد (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج)

ضخامت کتاب ۵۰۸ صفحات۔ تقطیع بڑی

قیمت سات روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:۔ کتابستان ۔ الہ آباد

"گلہائے پریشاں" فارسی اور اُردو شعراء کے چوٹی کے کلام کا بیمثل گلدستہ ہے۔ آغاز عشق سے انجام عشق تک جتنے مراحل پیش آتے ہیں اُنکے متعلق سرخیاں قایم کی گئی ہیں اور چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ہر سرخی کے تحت میں تقدم اور تاخر کے لحاظ سے درج ہیں۔ مراحل محبت کی سرخیوں کے علاوہ خمریات، مذہبیات، اخلاقیات وغیرہ کے متعلق بھی سرخیاں قایم کی گئی ہیں۔ سرخیاں سیکڑوں ہیں۔ اگر کسی شعر کے متعلق کوئی لطیفہ درج ہے۔ اساتذۂ سابق کی تیس تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں اُردو ادب میں یہ کتاب ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کا دوسرا مجموعہ

"نقشِ آزاد"

مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ہیں۔ ۸۰ صفحات غالب غالبیات سے تعلق رکھتے ہیں، سات روپیہ پیشگی بھیجکر دفتر نگار سے حاصل کر سکتے ہیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

پنکھڑی کا بند ورق

(وقار احمد رضوی - دہلی)

ایک شاعر کی نظم کے دو مصرعے ہیں :-

جس کی ہر پنکھڑی کا بند ورق
مُسکراہٹ کے انتظار میں ہے

مجھے اس پہلے مصرع :-

" جس کی ہر پنکھڑی کا بند ورق "

پر اعتراض ہے -

الف - کتاب کا ورق یا اوراقِ گل کی مناسبت سے گل کا ورق تو کہتے ہیں نہ کہ پنکھڑی کا ورق -

ب - ورق عربی میں پتّے کو کہتے ہیں - اور صاحبِ فرہنگ آصفیہ نے پنکھڑی کے معنی ورقِ گل کے دئے ہیں - اس کی روشنی میں پہلے مصرع کا ترجمہ ہوا - جس کی ہر پنکھڑی کی بند پنکھڑی - میرا مطلب یہ ہے کہ شاعر کو ہر پھول کا بند ورق یا ہر پھول کی بند پنکھڑی کہنا چاہئے تھا - اس باب میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

(نگار) میری رائے میں آپ کا اعتراض زیادہ وزنی نہیں ہے -

پنکھڑی، پھول کی بھی ہوتی ہے اور کلی کی بھی - فرق یہ ہے کہ کلی کی پنکھڑی بند ہوتی ہے اور پھول کی کھلی ہوئی - اس لئے اگر آپ ان دونوں میں تفریق کرنا چاہیں گے تو اس کی صورت صرف یہی ہوگی کہ آپ پھول کی پنکھڑی کو کھلی ہوئی پنکھڑی کہیں اور کلی کی پنکھڑی کو بند پنکھڑی -

صاحب فرہنگ آصفیہ نے آپ کو مغالطہ میں ڈال دیا - چاہئے تھا کہ وہ پنکھڑی کے معنے "پھول کی پتّی" لکھتے ، انھوں نے اسے " ورقِ گل " لکھ دیا -

ورق گل کا ترجمہ تو بے شک وہ پنکھڑی کر سکتے تھے ، لیکن پنکھڑی کو ورق گل کہکر اس کو اور زیادہ بعید الفہم بنا دینا مناسب نہ تھا -

بہرحال آپ کو جو شبہ پیدا ہوا ہے اس کا سبب زیادہ تر " فرہنگ آصفیہ " ہے اور آپ نے سمجھ لیا کہ محض ورق کہکر بھی پنکھڑی کا مفہوم لیا جا سکتا ہے ، حالانکہ یہ صحیح نہیں - عربی میں وَرَقٌ - وَرِقٌ اور وَرْقٌ ، سب کا مفہوم علٰحدہ علٰحدہ ہے - خیر وَرِقٌ اور وَرْقٌ کو

چھوڑئے کہ وہ خارج از بحث ہیں، لیکن وَرَق کو لیجئے، تو معلوم ہوگا کہ اس کے بھی کئی معنی ہیں۔ کٹا ہوا کاغذ، پتّی، خون کا قطرہ وغیرہ وغیرہ اس لئے محض ورق کے معنے پنکھڑی کے نہیں ہوسکتے لیکن پنکھڑی کو ورقِ گل ضرور کہہ سکتے ہیں۔

اس شعر میں پنکھڑی اور ورق دونوں ایک ہی چیز ہیں اور جب مشبہ و مشبہ دونوں ایک ہی چیز ہوتے ہیں تو اکثر اس قسم کے استعارۂ تشبیہی سے کام لیا جاتا ہے۔

اگر یہ مصرع یوں ہوتا:۔ "جس کی ہر بند پنکھڑی کا ورق" تو شاید آپ کو زیادہ اعتراض نہ ہوتا۔ بہرحال میرے نزدیک آپ کا اعتراض درست نہیں، کیونکہ ورق یہاں اس طرح استعمال ہوا ہے کہ وہ پنکھڑی کا بدل بھی ہوسکتا ہے۔

قبۃ الصخرا

(سید یاسین احمد صاحب)

قبۃ الصخرا کی روایتی اہمیت کیا ہے اور تاریخی حیثیت سے اس کا کیا مرتبہ ہے۔

(نگار) صخرا، چٹان کو کہتے ہیں اور چونکہ اس پر قبہ بن گیا ہے اس لئے اسے قبۃ الصخرا کہتے ہیں۔

اس کی روایتی اہمیت اتنی ہے کہ اگر تمام روایتوں کو یکجا کر دیا جائے جو اس کے متعلق مذہبی لٹریچر میں پائی جاتی ہیں تو ایک اچھی خاصی کتاب MY THS کی طیار ہوسکتی ہے۔

عہد عتیق کی انجیل میں تو اس کا کہیں ذکر نہیں ہے، لیکن تالمود میں بے شک اس کا ذکر موجود ہے جس سے اس کی قدامت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ یعنی یہ کہ یہاں ابراہیمؑ و سلیمانؑ نے قربانی کی اور داؤدؑ نے نماز پڑھی۔ لیکن مسلمانوں کی روایات میں اس کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا جاتا ہے اور بڑی عجیب عجیب باتیں اس سلسلہ میں بیان کی جاتی ہیں مثلاً:۔

۱۔ پیدائش آدم سے دو ہزار سال قبل یہ چٹان فرشتوں کی زیارتگاہ تھی۔

۲ طوفان کے وقت نوحؑ کی کشتی یہیں آکر ٹھہری تھی۔

۳۔ دراصل فردوسی چٹان ہے۔

۴۔ قیامت میں اسرافیل اسی چٹان پر کھڑے ہوکر اپنا صور پھونکیں گے۔

۵۔ قیامت سے پہلے کعبہ دلہن بناکر یہاں لایا جائے گا۔

۶۔ یہ چٹان ایک کھجور کی چوٹی پر قایم ہے اور اسی کھجور کے سایہ میں، آسیہ (فرعون کی بیوی) اور مریم (موسیٰ کی بہن) جنت کی نہروں کا ٹھنڈا پانی مومنوں کو پلائیں گی۔

۷۔ کرۂ زمین کے تمام شیریں چشمے یہیں سے نکلے ہیں۔

۸- یہ چٹان آسمان و زمین کے درمیان معلق ہے

۹- اس کے نیچے ایک کنواں ہے جہاں روحیں ہفتہ میں دو بار جمع ہوتی ہیں۔

۱۰- تمام پیغمبروں نے یہاں آکر نماز پڑھی ہے۔

۱۱- ستر ہزار فرشتے ہر وقت اس چٹان کی نگرانی کرتے ہیں۔

ان روایات پر کسی نقد و تبصرہ کی ضرورت نہیں، ان کا بے سر و پا ہونا ظاہر ہے، لیکن تاریخی حیثیت سے اس کی قدامت و اہمیت یقیناً بہت ہے۔

جب حضرت عمرؓ نے کعب الاحبار یہودی کے مشورہ سے یروشلم کو فتح کیا تو اس چٹان کو بہت گندہ پایا۔ آپ نے اسے صاف کرایا اور نماز ادا کی اور اسی لئے اسے مسجد عمر بھی کہا جاتا ہے، حالانکہ وہاں کوئی مسجد تعمیر نہیں ہوئی۔ اس کے بعد عبدالملک بن مروان (اموی خلیفہ) نے اس چٹان پر سیاسی مصلحت سے ایک قبہ یا گنبد تعمیر کرایا۔ سیاسی مصلحت یہ تھی کہ اُس وقت عبداللہ بن زبیر بھی خلافت کے دعویدار تھے اور حرمین کی آبادی پر ان کا بڑا اثر قایم تھا۔

زیارت حرمین کے لئے یروشلم کے لوگ بھی مکہ، مدینہ جایا کرتے تھے اور عبدالملک کو اندیشہ تھا کہ مبادا یہ عبداللہ بن زبیر کی طرف مایل ہوجائیں، اس لئے اس نے قبۃ الصخرا تعمیر کرایا اور اعلان کردیا کہ اسی کو لوگ حرمین سمجھیں اور اسی کی زیارت کریں۔ اس نے اس کی تعمیر اور آراستگی پر کثیر رقم صرف کی اور بہت سے قبے ایک ہی سلسلہ میں بنوا دئے جنھیں "قبۃ السلسلہ" کہتے ہیں۔

مقدسی نے اس کا ایک سبب اور بھی بیان کیا ہے، وہ یہ کہ قمامہ میں عیسائیوں کا ایک بڑا عالیشان کلیسہ پہلے سے موجود تھا اور عبدالملک چاہتا تھا کہ اسی کے مقابلہ کی عمارت یہاں بھی قایم کی جائے تاکہ مسلمان کلیسہ کی عمارت سے مرعوب نہ ہوں۔

اس کی تعمیر کے بانی کے متعلق فرگوسن کا خیال ہے کہ اسے کانسٹنٹین (بازنطینی فرمانروا) نے تعمیر کرایا تھا، لیکن یہ صحیح نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس کی تعمیر میں عبدالملک نے یونانی ماہرین فن سے ضرور مدد لی تھی اور بہت سے ستون یونانی عہد کے جو یہاں کے کھنڈروں میں پائے جاتے تھے ان سے بھی اس تعمیر میں کام لیا گیا، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کا بانی عبدالملک ہی تھا۔ اس پر خط کوفی میں جو عبارت کندہ ہے اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ عبدالملک نے ۷۲ھ میں اس کی تعمیر کرائی۔ اس کے بعد عباسی خلیفہ مامون الرشید نے اس کی مرمت کرائی۔

۸۴۶ء کے زلزلہ میں اس کو کچھ صدمہ پہونچا تو پھر اس کی مرمت ہوئی۔ لیکن جب ۱۰۱۶ء کے زلزلہ میں قبہ گر گیا تو خلیفہ حاکم نے از سر نو اس کو بنوایا۔

۱۰۹۹ء میں جب صلیبی جنگوں کے سلسلہ میں اس پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا تو اسے کلیسہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے بعد جب سلطان صلاح الدین نے یروشلم کو فتح کیا تو یہ کلیسہ پھر مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ بعد کو کسی حادثہ سے اس میں آگ لگ گئی اور ترکی سلیمان اعظم نے از سر نو اس کی تعمیر و آرایش کرائی۔

یہ چٹان ۵۶ فٹ لمبی اور ۴۲ فٹ چوڑی ہے اور اس کی شکل نصف دائرہ کی سی ہے۔ اس کو ہموار و مسطح بنانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ قدرت نے جو شکل اول دن سے اسے دیدی تھی وہی اب تک پائی جاتی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

جس وقت زائرین یہاں جاتے ہیں تو اس کا خاص لحاظ رکھتے ہیں کہ اس کا طواف بائیں طرف سے شروع کیا جائے، کعبہ کا طواف داہنے سے بائیں کو کیا جاتا ہے۔

(فیض احمد فیض)

جانتا ہے کہ وہ نہ آئیں گے — پھر بھی مصروف انتظار ہے دل
میری خاموشیوں میں لرزاں ہے — میرے نالوں کی گم شدہ آواز
ادائے حُسن کی معصومیت کو کم کر دے — گناہگار نظر کو حجاب آتا ہے
زیرِ لب ہے ابھی تبسم دوست — منتشر جلوۂ بہار نہیں
عشق دل میں رہے تو رسوا ہو، — لب پہ آئے تو راز ہو جائے،

فریبِ آرزو کی سہل انکاری نہیں جاتی — ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے
وفائے وعدہ نہیں، وعدۂ دگر بھی نہیں — وہ مجھ سے روٹھے تو تھے، لیکن اس قدر بھی نہیں
نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں، — اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں
یہ عہد ترک محبت ہے کس لئے آخر — سکون قلب اِدھر بھی نہیں اُدھر بھی نہیں

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے — وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے
بھولے سے مسکرا تو دئے تھے وہ آج فیض — مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

آس اُس در سے ٹوٹتی ہی نہیں، — جا کے دیکھا، نہ جا کے دیکھ لیا
آج ان کی نظر میں کچھ ہم نے — سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا

تھی، مگر اتنی رائگاں بھی نہ تھی — آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے
ساری دنیا سے دور ہو جائے — جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے

(اختر سکندروی)

پھر چمن میں ہوا اُجالا سا — پھر کوئی شاخ جل گئی ساقی
مجھ سے دُنیا نے درس ہوش لیا — میں گرا وہ سنبھل گئی ساقی
روئے تاباں کا ذکر چھڑتے ہی — ماہ و اختر میں چل گئی ساقی

شاید یہ انتہائے شکیب و قرار ہے — جو غم کہ ناگوار تھا اب خوشگوار ہے
یہ سچ ہے آفتاب ہے گردش میں رات دن — لیکن وہ صبح جس کا مجھے انتظار ہے

دل اک نئی دنیائے خیالات میں گم ہے — دیکھا تھا سر بزم انھیں چپ چپ آج
پہلے تو نسیم اتنی توجہ نہ تھی مجھ پر — شاید انھیں آیا ہے مرے غم کا یقیں آج

"طرز بیدل میں....."

(عطا کاکوی)

یوں نشہ جھلکتا ہے فروغِ مے سے — آئینے میں عکس گل پڑا ہو جیسے
کہنے کو تو اس کو پھول کہہ لیں، لیکن — ہاتھوں سے اپنے اس کو توڑیں کیسے؟

ادراک کا کتنا ہی تو کر تیز چراغ — اسرارِ فلک تک نہیں پردازِ دماغ
بے تھاہ محیط اور اس کی تہ میں — پوشیدہ ہے اک گوہر نایاب سراغ

مانا کہ تمیز کفر و دیں ہے معیوب — حق مدِ نظر ہے تو ہیں دونوں محبوب
کعبہ اور دیر سر بھی ٹکرائیں تو کیا — دو سنگ کی جنگ سے ہے آتش مطلوب

سایہ گر لوٹ کر کے آیا بھی، تو کیا؟ — جلوے سے عکس دور بھاگا بھی تو کیا؟
وہ ہے عدم و وجود سے بے پروا — خورشید کو گرد ہو نپے دیکھا بھی تو کیا؟

آئینہ میں عکسِ گل کی ہے جو تنویر — وہ اصل نہیں ہے اصل کی ہے تصویر
ہے دل میں جمال یار روشن اس طرح — شبنم میں ہو جس طرح سے خورشید اسیر

(ارشد صدیقی)

محبت میں اچھے بُرے سب زمانے گزرنے کو یوں تو گزرتے ہیں لیکن — غم و بیکسی کا وہ عالم نہ پوچھو کہ جب آس بندھتے ہی دل ٹوٹ جائے
ہجومِ تمنا کی افزائشوں نے زمانے میں مجھ کو کہیں کا نہ رکھا — ہوا ہے مرے دل کا یہ حال جیسے کنارے پہ آکر کوئی ڈوب جائے
تھے ایسے بھی ٹکڑے مری داستاں میں جنھیں خود وہ اپنا ہی افسانہ سمجھے — وہ حصہ مگر حاصلِ داستاں تھا جہاں انکی آنکھوں میں آنسو بھی آئے

اُن شرم سے بوجھل پلکوں پر آج اشکِ تمنا دیکھ لیا، — آنکھوں کے گلابی ڈوروں سے کٹتے ہوئے ہیرا دیکھ لیا،
پھولوں کے چھلکتے جاموں سے تاروں کی فروزاں شمعوں تک — جس رنگ میں چاہا ہم نے تجھے اے جانِ تمنا دیکھ لیا،

بیدرد ستاروں کو ارشد اُس وقت سکوں کی نیند آئی
ہنگامِ سحر جب غنچوں کے ماتھے پہ پسینہ دیکھ لیا

(شاہد صدیقی)

کبھی خرد کا کبھی عشق کا بہانہ تھا
مری حیات کا مقصد فریب کھانا تھا

جہاں جہاں میں رُکا وقت کے قدم بھی رُکے
مرا وجود خود اپنی جگہ زمانہ تھا

چمن کے ایک ہی گوشہ میں ہے ہجوم بہار
یہ وہ جگہ ہے جہاں میرا آشیانہ تھا

کبھی کبھی تو وہ عالم گزر گیا شب غم
ترا خیال بھی گزرا ہوا زمانہ تھا

خزاں کا خوف تھا غنچوں کو فصل گل میں مگر
وہ مسکرا کے رہے جن کو مسکرانا تھا

ظلمتِ شبِ غم میں دل کو خون کرنا تھا
صرف آہ کرنے سے روشنی نہیں ہوتی

آپ سے جدا ہو کر میرا تجربہ یہ ہے
زندگی کی ہر ساعت زندگی نہیں ہوتی

ہیں فراق کی راتیں ایک طلسم محرومی
چاند جگمگاتا ہے چاندنی نہیں ہوتی

انتظارِ ساقی میں، چاہے جتنی پی لیجئے
اک سرور ہوتا ہے بیخودی نہیں ہوتی

اب اپنے آپ سے شکوہ ہے بیوفائی کا
بہت دنوں میں ہوئی فطرتِ وفا معلوم

وہی فنا سے حفاظت کی سعی جاری ہے
خرد کو رازِ بقائے دوام کیا معلوم

سب اپنے زخم دکھاتے پھرے تجھے لیکن
تری نظر پہ جو گزری کسی کو کیا معلوم

راہ رو کے ہوئے ہیں دشت و گلستاں کتنے
پھر بھی مجھ تک ترے دامن کی ہوا آتی ہے

اب مری راہ میں حایل نہیں دشواریِ رہ
جستجو دوریِ منزل سے سکوں پاتی ہے

کون سمجھے اثرِ سوزِ محبت شاہد
یہ وہ بجلی ہے جو گرتی ہے نہ لہراتی ہے

(حفیظ نعیمی)

مسکراہٹ کی رنگیں آغوش میں آنسوؤں کے بھی طوفاں پلتے رہے
تیرہ و تار راتوں کے طاقوں پہ بھی آفتابوں کے قندیل جلتے رہے

باہمہ بے نیازی و بیگانگی اک تعلق رہا حسن کو عشق سے
میرے رونے پہ وہ ہنس دئے بارہا، یوں بھی اکثر نکلتے رہے

عقلِ کوتاہ اندیش گو عمر بھر طوق و زنجیر و زنداں بناتی رہی
مرحبا گرمیِ عزمِ اہلِ جنوں! طوق و زنجیر و زنداں پگھلتے رہے

(اکرم دھولیوی)

اے ہم نفس نہ چھیڑ قفس میں چمن کی بات
کیا جانے فصل گل کدھر آئی کدھر گئی،

اب عمر بھر سکون میسر ہو یا نہ ہو
منزل کی شرط راہِ طلب میں ٹھہر گئی

چشمِ کرم بھی ایک ستم ہے ستم کے بعد
اے دوست دل کی چوٹ دوبارہ ابھر گئی

(شارق میرٹھی ام۔اے)

تم ستاتے تو ہو مجھ کو، لیکن — دامنِ ضبط اگر چھوٹ گیا
اُن کی نظروں سے ملیں جب نظریں — ہاتھ سے شیشۂ مے چھوٹ گیا
تجھ سے کس بات کا شکوہ کہ جنوں میں اکثر — اپنی حالت پہ مجھے آپ ہنسی آئی ہے
اُن کو جب پہلے پہل دیکھا تو محسوس ہوا — جیسے ان سے مری برسوں کی شناسائی ہے

رُباعیات

(شفیق مینائی)

(لالہ زارِ ہستی)

کیا کیجئے سیر لالہ زارِ ہستی — نظروں کو نہیں ہے اعتبارِ ہستی
اک خندۂ بے ثبات اک گریۂ غم — بس اتنی ہے فرصتِ بہارِ ہستی

(مفہومِ بہار)

بلبل نالوں سے دل ہلا دیتی ہے — شبنم طوفانِ اشک اُٹھا دیتی ہے
جب پوچھتے ہیں کلی سے مفہومِ بہار — معصوم ادا سے مسکرا دیتی ہے

(تضادِ گل و شبنم)

مجموعۂ اندوہ و مسرت ہے بہار — اک طرفہ تماشائے مشیت ہے بہار
شبنم نے کیا گریۂ غم سے تعبیر، — پھولوں نے کہا خندۂ عشرت ہے بہار

(ہستیِ گل)

گلشن کی یہ کائنات کے دن کی ہے؟ — رنگینیٔ بے ثبات کے دن کی ہے؟
شبنم کو تو دیکھتا ہے تحقیر سے تو — اے پھول تری حیات کے دن کی ہے؟

(گلِ شگفتہ)

طوفانِ حوادث سے جو ٹکراتا ہے — معراجِ کمال بھی وہی پاتا ہے
آسان نہیں گلِ شگفتہ بننا — سینہ غنچے کا چاک ہو جاتا ہے

(گل چیں)

تو دشمنِ لالہ و سمن ہے گلچیں، — تو رہزنِ دولتِ چمن ہے گلچیں
رنگیں ہے شگوفوں کے لہو سے ترے ہاتھ — دامن ترا پھولوں کا کفن ہے گلچیں

کسی کے نام ایک "خط"

(رعنا بلسوی)

ساحل گنگا سے کب دیپک چڑھا کر آ گئیں
لائیں بھی گنگا سے کچھ پالٹ لٹا کر آ گئیں؟

مانگ کو سیندور، اور ماتھے کو صندل بھی ملا
کچھ چُرا کر لائیں بھی پوجے ہوئے پھولوں سے رنگ
بجھ گئے یا جھلملائے، موجِ گنگا کے چراغ
کس کا دامن تھام کر گنگا میں رکھتی تھیں قدم
شام ہی سے چاند کی دُنیا، تری دُنیا کی شام
ہر قدم پر عطر افشاں جھلملاتی ساریاں
مطمئن ہے حُسن پیمانِ وفا بھولے ہوئے
یاد میں بیتے دِنوں کی اس قدر گرمی کہاں
کیا نہاتے وقت رعنا بھی تمھیں آیا تھا یاد،
خیر یہ سب وقت کی باتیں تھیں جو میں کہہ گیا
پوجنے ہر سال جاؤ ساحلِ گنگا کی شام
"خوبصورت سا" تمھیں اپنی دُعا کا پھل ملے

مندروں کو لوٹنے کا شوق بھی پورا ہو ؟
موجِ گنگا پوجنے کی تھی بہت تم کو اُمنگ
کس ادا سے تم نے چھوڑے تھے تمنا کے چراغ
یاد بھی آتا تھا کوئی آنکھ بھی ہوتی تھی نم،
کیا قیامت خیز ہو جاتی ہے آف گنگا کی شام
حُسن بے پردہ کی وہ پردے میں جلوہ یاریاں
نذرِ گنگا کر دئے کافر نے دل ٹوٹے ہوئے
جلوہ گاہِ ناز میں گنگا کی سی سردی کہاں
ہاں وہی آوارہ شاعر بدنصیب و نامراد
مُفت دامن غم کے کانٹوں سے اُلجھ کر رہ گیا
اس کا کیا غم ہے اگر اُجڑی رہے رعنا کی شام
مجھ کو جامِ غم، تمھیں پینے کو گنگا جل ملے،

شاعر

(ام۔ اے حفیظ بنارسی)

دوستو تم نے بخوبی مجھ کو سمجھا ہی نہیں
مجھ کو قدرت نے دیا ہے اس قدر حساس دل
میری باتیں ہیں سراسر خواب یہ بہتان ہے
سوچتے ہیں لوگ لیکن جس کو کہہ سکتے نہیں
"زلفِ جاناں" ہی نہیں میرے عمل کی بارگہ
چادرِ گل پر بھی نیند آتی نہیں مجھ کو کبھی
گوشۂ خلوت میں بھی رہتا ہوں اکثر مطمئن،
کھول دیتا ہوں میں آسانی سے سرِ کائنات
وید و قرآں ہو کہ انجیلِ مقدس کی سطور

معنیٔ شاعر ہے کیا آؤ کہ سمجھاتا ہوں میں
چوٹ لگتی ہے کسی کو اور تڑپ جاتا ہوں میں
ہاں حقیقت کو لباسِ خواب پہناتا ہوں میں
بس اسی کو دلنشیں لفظوں میں کہہ جاتا ہوں میں
زندگی کی کاکلِ پرخم بھی سلجھاتا ہوں میں
اور کبھی یہ حال کانٹوں پر بھی سو جاتا ہوں میں
اور اکثر عیش گاہوں میں بھی گھبراتا ہوں میں
زندگی اور موت کے رازوں کو سمجھاتا ہوں میں
عکس اپنا ہر حسیں تحریر میں پاتا ہوں میں

مطبوعات موصولہ

نقشِ آزاد مجموعہ ہے مولانا ابوالکلام آزاد کی بعض تحریروں کا جسے کتاب منزل لاہور نے حال ہی میں شایع کیا ہے۔ یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو مولانا مرحوم نے غلام رسول مہر کے نام لکھے تھے۔ سب سے پہلا خط سب سے پہلا خط مئی ۱۹۱۴ء کا ہے، اس کے بعد ۱۹۱۶ء سے یہ سلسلہ شروع ہوکر ۱۹۴۶ء پر ختم ہوتا ہے۔ ان خطوط سے اس دور کے بہت سے سیاسی مسایل پر روشنی پڑتی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مولانا کا سیاسی نقطۂ نظر ابتدا ہی سے کیا تھا اور جس راہ کو انھوں نے اپنے لئے منتخب کرلیا تھا اس پر وہ کتنی مضبوطی کے ساتھ قایم رہے۔

دوسرے حصہ میں وہ تحریریں ہیں جن میں کلام غالب پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی اور اس سلسلہ میں بعض ایسی باتیں بھی آگئی ہیں جن کا علم کم لوگوں کو حاصل تھا۔ یہ حصہ ادبی و انتقادی حیثیت سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

تیسرے حصہ میں ۱۶ مکاتیب ہیں۔ اس میں آٹھ خطوط خواجہ حسن نظامی کے نام ہیں اور چار نیاز فتحپوری کے نام جو زیادہ تر نجی حیثیت رکھتے ہیں۔

کتاب نہایت اہتمام سے مجلد شایع کی گئی ہے اور ۳۶۰ صفحات کو محیط ہے۔ قیمت چھ روپے۔

فلسفۂ اخلاق تصنیف ہے جناب بشیر احمد ڈار کی جسے ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور نے شایع کیا ہے اس کتاب میں فاضل مصنف نے تمام اہم فلاسفۂ اخلاق کے نظریوں کی وضاحت کی ہے۔ سب سے پہلے کنفوشس (چینی) کے فلسفہ کو لیا ہے، اس کے بعد گوتم بدھ، بھگوت گیتا، زرتشت، مانی، سقراط، افلاطون و ارسطو کے اصول اخلاق کی تشریح کی ہے۔ اور اخیر میں رواقی و مصری فلسفۂ اخلاق کو پیش کیا ہے۔ مذاہب عالم کی تاریخ کا اہم ترین حصہ وہی ہے جو تعلیم اخلاق سے تعلق رکھتا ہے اور اسی کے پیشِ نظر ہم کو اس کا فلسفہ سمجھنے کی جستجو ہوتی ہے، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ ان مذاہب نے جو اپنے سماوی ہونے کے مدعی ہیں، مذہب کو فلسفہ کی حیثیت سے کبھی پیش نہیں کیا اور فکر و تعقل کو مقررہ خیالات و معتقدات سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ مثلاً موسوی، عیسوی اور اسلامی مذاہب کو لیجئے کہ انھوں نے اخلاق کی تعلیم تو دی لیکن اسکا کوئی فلسفہ نہیں بتایا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تعلیم بلحاظ نتائج، فلسفہ کے حدود میں آجائے لیکن یہ بالکل اعتقادی چیز ہوگی اور فکر و تعقل سے اسے کوئی واسطہ نہ ہوگا برخلاف اسکے دنیا کے ان مذاہب میں جو تاریخی عہد سے تعلق رکھتے ہیں کانفوشس، بھگوت گیتا، گوتم بودھ، زرتشت، مانی، سقراط افلاطون و ارسطو کی تعلیمات اور رواقی و مصری فلسفۂ اخلاق خاص اہمیت رکھتے ہیں اور اس کتاب میں انھیں تمام معلمین اخلاق کے نظریوں کو پیش کیا گیا ہے۔

اس قسم کی کتابیں اکثر و بیشتر بہت خشک ہوتی ہیں لیکن اس کتاب کے فاضل مصنف نے ان تمام مسایل کو سلیس و شگفتہ انداز بیان سے بہت دلچسپ بنادیا ہے اور ذہن و دماغ پر مطلقاً کوئی بار نہیں پڑتا۔

قیمت چھ روپیہ۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ ۲۔ کلب روڈ لاہور۔

سکھ مسلم تاریخ تصنیف ہے جناب ابوالامان امرتسری کی جس میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ سکھ مسلم تعلقات ابتدا میں کتنے خوشگوار تھے اور بعد کی ان دونوں جماعتوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے انگریزی مورخین نے کس قدر دسیسہ کاری سے کام لیا ہے۔ سکھ تاریخ کا آغاز عہد مغلیہ سے ہوتا ہے اور اس زمانہ کی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ مغل بادشاہوں نے سکھ گرو صاحبان کا کتنا احترام کیا اور کتنی جاگیریں ان کو عطا کیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ گرو صاحبان اسلام، قرآن و رسول کی بابت کتنا اچھا خیال رکھتے

تھے اور مسلمانوں کے عام اخلاق کے وہ کتنے مداح تھے۔

یہ ہے بنیادی خیال اس تصنیف کا اور اس میں شک نہیں کہ فاضل مصنف نے بڑی کدو کاوش سے وہ تمام واقعات یکجا کر دئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ سکھ مسلک کے بانی کتنے بلند اخلاق کے تھے، مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات کتنے گہرے تھے اور پھر بعد کو انگریزوں نے کن کن ترکیبوں سے ان دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا۔ سب سے بڑی چال جو اس سلسلہ میں چلی گئی وہ یہ روایت تھی کہ گرو تیغ بہادر کو اسلام نہ لانے پر اورنگ زیب نے قتل کرا دیا۔ لیکن ابوالامان صاحب نے خود سکھوں اور بعض مغربی مورخین کی کتابوں سے ثابت کیا ہے کہ یہ واقعہ بالکل غلط ہے اور اورنگ زیب، گورو تیغ سے ملا ہی نہیں۔ اسی طرح گورو گوبند سنگھ کے بچوں کے قتل کے متعلق جو روایات بیان کی جاتی ہیں، اس کتاب میں ان کی بھی تردید کی گئی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا مطالعہ مسلمانوں سے زیادہ خود سکھوں کو کرنا چاہئے، تاکہ مسلمانوں کی طرف سے جو بدظنی انکے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے وہ دور ہو سکے اور وہ صحیح روشنی میں سکھ مسلم تعلقات کا مطالعہ کر سکیں۔ کتاب نہایت دلچسپ انداز میں پوری مورخانہ ذمہ داریوں کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ ضخامت ۲۴۲ صفحات۔ قیمت ۴ ہے۔ ملنے کا پتہ:- ادارۂ ثقافت اسلامیہ ۲- کلب روڈ۔ لاہور۔

ایک آہنگ مجاز

ایک ضخیم کتاب ہے جو مجاز مرحوم کی یاد میں مکتبۂ افکار کراچی نے شایع کی ہے۔ اور جناب صہبا لکھنوی مدیر افکار نے مرتب کی ہے۔

مجاز کی جوانمرگی اس میں شک نہیں ایک بڑا ادبی حادثہ تھا جسے پاکستان و ہندوستان دونوں جگہ محسوس کیا گیا اور ہر ادبی ادارہ نے مرحوم کا سوگ منایا۔

مجاز دورِ حاضر کے بڑے محبوب شاعر تھے، اپنی ذاتی خصوصیات کی وجہ سے بھی اور اپنے فن کے لحاظ سے بھی، وہ فطرتاً بڑے نیک نفس مرنجاں مرنج انسان تھے اور اپنے شاعرانہ فکر و احساس کے لحاظ سے بڑے اچھے شاعر۔ ان کی یہ خصوصیت کہ قدیم و جدید دونوں دبستان سخن نے ان کو یکساں سراہا ہم کو کسی دوسرے شاعر میں بہت کم ملتی ہے اور اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ ان کی شاعری صحیح معنی میں تغزل کی شاعری تھی اور انھوں نے باوصف ترقی پسند شاعر ہونے ہونے کے کلاسکل شاعری کو خصوصیات کو کبھی ہات سے نہیں جانے دیا۔

وہ یقیناً اس کے اہل تھے کہ ان کو کثرت سے یاد کیا جائے اور ان کی شاعرانہ خصوصیات کو بار بار دہرایا جائے۔ چنانچہ ان کی موت کے بعد ہر بزم سخن اور ہر حلقۂ ادب میں ان کا ماتم کیا گیا اور ان کے محاسن شاعری پر اچھے اچھے مضامین شایع کئے گئے۔

یہ کتاب بھی مجاز اور ان کی شاعری کا اعتراف ہے، ایک بڑا مکمل اعتراف جو ۵۲۰ صفحات کو محیط ہے۔

مجاز کی زندگی اور شاعری کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کو اس کتاب میں پیش نہ کیا گیا ہو اور ایسے غیر معمولی سلیقہ کے ساتھ کہ اگر مجاز کو معلوم ہوتا کہ ان کی یاد اس طرح بھی منائی جا سکتی ہے تو شاید وہ اس سے پہلے ہی جان دینے پر راضی ہو جاتے۔

مجاز کے مطالعہ اور ان کی شاعری کی اہمیت کا صحیح مطالعہ کرنے کے لئے یہ کتاب انسائکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے اور مکتبۂ افکار کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ کتاب نہایت نفیس کاغذ پر شایع کی گئی ہے اور دس روپیہ میں مکتبۂ افکار رابسن روڈ کراچی سے مل سکتی ہے۔

عمر فاروق اعظم

ترجمہ ہے ڈاکٹر محمد حسین ہیکل مرحوم کی مشہور تالیف کا جسے جناب حبیب اشعر نے ترجمہ کیا اور مکتبۂ جدید لاہور نے شایع کیا۔ ہیکل، حبیب اشعر، اور مکتبۂ جدید ان تینوں کا اجتماع کسی کتاب کی ظاہری و معنوی خوبیوں کا اتنا بڑا نشان ہے کہ اس پر نہ کسی تبصرہ کی ضرورت ہے، نہ تعارف کی۔

ہیکل اس عہد کا نہایت مشہور مورخ تھا جس نے تاریخ نگاری اسلوب بدل دیا اور تاریخ کو ادبی چیز بنا دیا۔ اس کی تصانیف میں حیات محمد اور عمر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ نہ اس لحاظ سے کہ اس نے ان دو بڑے انسانوں کے صحیح حالات پیش کئے بلکہ اس لئے کہ یہ دونوں کتابیں جدید تاریخ نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

عمر فاروق کی شخصیت تاریخ اسلام کی اتنی بڑی شخصیت تھی کہ اگر وہ پیدا نہ ہوتی تو اسلام غالباً حدودِ عربستان سے بھی رخصت ہو گیا ہوتا، باہر کی دنیا کا کیا ذکر۔ محمدؐ اسلام کے بانی تھے اور عمر اس کے معمار۔ لیکن یہ محض "تعمیرِ گنبدِ دستار" نہ تھی جو موجودہ علماء اسلام کا شیوہ ہے بلکہ یہ اخلاق و سیاست کی اتنی بڑی تعمیر تھی کہ اس کی مثال ہم کو کسی دوسری قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

ہیکل کا مقصود اس تصنیف سے عمر کی اس خصوصیت کو نمایاں کرنا تھا اور اس میں شک نہیں کہ اس بڑے کام کو ہیکل ہی جیسا بڑا مورخ انجام دے سکتا تھا۔ یہ کتاب عمر کی محض سیرت نہیں ہے بلکہ ان کی زندگی، ان کے مذہب، ان کے کردار، ان کی قوت عمل، ان کے بلند اخلاق، ان کی غیر معمولی عزیمت و پامردی اور ان کی سیاست دانی کا تفصیلی تجزیہ ہے جو بڑی تقطیع کی گنجان لکھی ہوئی کتاب کے تقریباً ۸۰۰ صفحات کو محیط ہے۔ ترجمہ کے متعلق اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسے حبیب اشعر نے کیا ہے اور کتاب کے حسن طباعت کے اظہار کے لئے صرف مکتبۂ جدید کا نام لے دینا کافی ہے، اس میں شک نہیں کہ اس کتاب میں طوالت بیان ضرور پائی جاتی ہے، لیکن حکایت لذیذ کا دراز تر ہو جانا کوئی عیب نہیں۔

مرزا محمد علی فدوی یہ مقالہ ہے ڈاکٹر سید محمد حسنین کا جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے انھوں نے لکھا تھا۔ مرزا محمد علی فدوی کا اصل وطن شاہجہاں آباد تھا لیکن بعد میں وہ کسی سلسلہ سے عظیم آباد آ گئے آ گئے اور یہیں کے ہو رہے۔ یہ سودا اور درد کے ہمعصر تھے اور ان کا شمار اچھے شاعروں میں ہوتا تھا، لیکن ان کے حالات و کلام سے لوگ ناواقف تھے۔ اس لئے مقالہ کے لئے ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ انتخاب بہت موزوں و مناسب تھا اور جس اہتمام و کاوش سے یہ کام انھوں نے انجام دیا وہ ڈاکٹریٹ کی سے بھی زیادہ کسی اور بلند اعزاز کا مقتضی تھا۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ حصۂ اول متعدد ابواب میں منقسم ہے۔ سب سے پہلے اس عہد کے عظیم آباد کی ثقافت و معاشرت کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد عہدِ فدوی کے اکابر علم و ادب کا۔ تیسرے باب میں فدوی کے متعلق تمام تذکروں کا اقتباس پیش کیا گیا ہے اور آخری باب میں فدوی کی شاعری اور ان کی زبان پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ حصہ ۳۵۲ صفحات کو محیط ہے۔

دوسرا حصہ فدوی کے کلام کا ہے جس میں ان کی غزلیں، رباعیاں، واسوخت، ترجیع بند، قطعات و مثنوی سب کچھ شامل ہے۔ اور متعدد نسخوں کو سامنے رکھ کر ایڈٹ کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں ڈاکٹر صاحب نے یہ مقالہ لکھ کر بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے۔ دونوں حصوں کی قیمت دس روپیہ ہے اور ضخامت تقریباً ایک ہزار صفحات۔ ملنے کا پتہ:۔ اردو سوسائٹی پٹنہ۔

۱۸۵۷ء ۱۸۵۷ء کے چشمدید واقعات کا فارسی روزنامچہ ہے جسے عبداللطیف نے مرتب کیا تھا۔ عبداللطیف ایک معزز خاندان کا فرد تھا اور اس کی رسائی قلعۂ دہلی تک تھی۔ اس روزنامچہ میں اس نے ۱۱ مئی ۵۷ء سے لیکر ۱۴ ستمبر ۵۷ء کے تمام چشمدید واقعات درج کئے ہیں اور تاریخی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

یہ کتاب کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلا اور اہم ترین حصہ مقدمہ کا ہے جس میں پروفیسر خلیق احمد نظامی نے پوری تاریخ انقلاب کو چند صفحات میں انتہائی جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا ہے، دوسرا حصہ اصل روزنامچہ کا ہے اور تیسرا اس کے اردو ترجمہ کا۔

اس کتاب کو زیادہ مفید بنانے کے لئے فاضل مترجم و مقدمہ نگار نے ان تمام اشخاص و افراد کے بھی مختصر حالات درج کر دئے ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے اس عہد کے تاریخ سے تعلق رکھتے تھے۔

طباعت و کتابت بہت دیدہ زیب، کاغذ دبیز، جلد مضبوط۔ ضخامت ۲۱۲ صفحات۔ قیمت ساڑھے تین روپیہ۔
ملنے کا پتہ:۔ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد۔ دہلی۔

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات

اس کتاب میں پروفیسر خلیق احمد نظامی نے سلطان قطب الدین ایبک سے لیکر سلطان ابراہیم لودی تک تمام سلاطین کے مذہبی افکار و عقاید، نظامِ حکومت پر اس کے اثرات اور تاریخ اسلام میں سلطنت دہلی کی حیثیت پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔

آزادیِ ہند سے قبل مسلم سلاطین دہلی کی تاریخ کا علم ہم کو زیادہ تر مغربی مورخین کی کتابوں سے ہوتا تھا، جن میں بربنائے سیاسی مصلحت کافی تحریف و تدلیس سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن اب آزادی ہند کے بعد خود اہل ملک نے صحیح تاریخ نگاری کی طرف توجہ کی ہے اور متعدد کتابیں اس وقت تک شایع ہو چکی ہیں، انھیں میں سے ایک پروفیسر نظامی کی یہ تالیف بھی ہے جو مورخانہ کاوش و دیانت کے لحاظ سے قدر اول کی چیز ہے چونکہ فاضل مولف مسلم یونیورسٹی میں استاذ ہیں، اس لئے ان سے زیادہ موزوں اس تصنیف کا اور کوئی نہ ہو سکتا تھا اور اس میں کلام نہیں کہ تحقیق و جستجو کا کوئی پہلو ایسا نہیں جسے انھوں نے نظر انداز کر دیا ہو۔

اس کتاب کی تالیف کے لئے فاضل مولف نے سیکڑوں عربی، فارسی، انگریزی کی کتب تاریخ کا مطالعہ نہایت ژرف نگاہی سے کیا ہے اور اپنے نتائج مطالعہ کو حد درجہ خوش اسلوبی کے ساتھ قلمبند کر کے اس کتاب کو پیش کیا ہے۔

یہ کتاب نہ صرف اپنے موضوع بلکہ اُس عہد کے عام تاریخی حالات کے لحاظ سے بھی بڑی قابلِ قدر تصنیف ہے۔ اس کتاب کی طباعت و کتابت میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ اور نہایت نفیس کاغذ پر مجلد شایع کیا گیا ہے۔ ضخامت ۴۸۶ صفحات۔ قیمت نو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- ندوۃ المصنفین اُردو بازار۔ جامع مسجد۔ دہلی

تاریخ گجرات

تالیف ہے مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم کی جس میں کرشن مہاراج کے عہد سے لیکر محمد تغلق شاہ اور مظفر خاں آخری ناظم گجرات تک کے سیاسی و جغرافی حالات درج ہیں۔ مولانا مرحوم بڑے پایہ کے عالم و محقق تھے اور اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے جس نے شبلی، سلیمان ندوی، سہیل اعظمی وغیرہ متعدد نفوس پیدا کئے۔

مرحوم اخیر عمر میں احمد آباد کے ادارۂ ودیا پیٹ سے وابستہ ہو گئے تھے اور یہیں انھوں نے اس کتاب کو مرتب کیا۔ جو افسوس ہے ان کی زندگی میں شایع نہ ہو سکی۔

سرزمین گجرات کو تاریخ ہند میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اور ضرورت تھی کہ اس کی کوئی صحیح تاریخ اُردو میں مرتب کی جاتی۔ پھر یہ بھی حُسن اتفاق تھا کہ مرحوم کا آب و دانہ انھیں گجرات لے گیا اور اس طرح ایک بڑی اہم تصنیف ہمارے ہاتھ آگئی۔

مولانا بڑے فاضل انسان تھے اور تاریخ نگاری کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے اس لئے عربی، فارسی کا کوئی ماخذ ایسا نہیں جو ان کے سامنے نہ رہا ہو اور اپنے نتائج مطالعہ کو نہایت خوش اسلوبی سے پیش نہ کیا ہو۔

مرحوم کے انتقال کے بعد اس کتاب کی اشاعت کی امید کم تھی، لیکن ندوۃ المصنفین نے جو علم و ادب کی گرانقدر خدمات انجام دے رہا ہے، اس بے بہا تصنیف کو بھی مٹنے نہ دیا اور اسے نہایت اہتمام سے شایع کر کے اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا۔ ضخامت ۴۸۸ صفحات، قیمت آٹھ روپیہ - ملنے کا پتہ :- ندوۃ المصنفین اُردو بازار دہلی۔

جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات

اسرار احمد صاحب آزاد نے جو ملک کے بڑے باخبر صحافی ہیں، اس سے قبل دو کتابیں اس موضوع پر شایع کر چکے ہیں، پہلی جلد ۱۹۵۱ء میں شایع ہوئی، دوسری جلد کا پہلا حصہ ۱۹۵۶ء میں شایع ہوا اور دوسرا حصہ اب شایع ہوا ہے۔

پہلی جلد میں بین الاقوامی شخصیتوں، دُنیا کے سیاسی رجحانات اور ممالک عالم کی سیاسی، اقتصادی و عسکری اہمیت سے بحث کی گئی تھی، دوسری جلد کے پہلے حصہ میں بین الاقوامی سیاسی تحریکات و معاہدات کا ذکر کیا گیا تھا۔ زیر تبصرہ حصہ بھی اسی کا تتمہ ہے جس میں تمام وہ بین الاقوامی معاہدے، نظرئے اور اعلانات وغیرہ شامل ہیں، جن کے سمجھے بغیر دنیا کے سیاسی مسایل پر کوئی رائے قایم نہیں کی جا سکتی۔

اپنے موضوع کی حیثیت سے یہ کتاب بڑی مکمل چیز ہے اور اسے اگر سیاسی انسائکلوپیڈیا کہا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔

اس میں شک نہیں فاضل مولف نے نہ صرف صحافیوں بلکہ خواص وعوام سب کے لئے بڑی مفید کتاب شایع کی ہے اور ہمیں امید ہے کہ ملک اس کی قدر کرے گا۔

یہ کتاب ۴۰۰ صفحات کو محیط ہے اور نہایت اہتمام سے مجلد شایع کی گئی ہے۔ قیمت ۴ر۔ ملنے کا پتہ:- مکتبۂ برہان - جامع مسجد - دہلی

صنف انشائیہ اور چند انشائے صنف انشائیہ سے مراد Essay Writing ہے۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین صاحب نے اس کتاب میں اسی صنف کے ۲۸ نمونے ملک کے مشہور اہل قلم کے لکھے ہوئے جمع کردئے ہیں اور ابتدا میں ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر اس صنف کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

اردو میں اس صنف کا رواج زیادہ نہیں ہوا، حالانکہ ادیبوں کو اس طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت تھی۔

اس مجموعہ میں پطرس، فلک پیما، رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ، اور حاجی لق لق کے بھی چند انشائے نظر آتے ہیں جو واقعی معیاری حیثیت رکھتے ہیں، لیکن بعض انشائے اس میں ایسے بھی ہیں جن کو ہم صحیح معنی میں انشائیہ نہیں کہہ سکتے۔

ضخامت ۲۹۴ صفحات - قیمت چار روپیہ - ملنے کا پتہ:- ایوان اردو - پٹنہ

ترکی نظام طب کی تاریخ یہ کتاب ترجمہ ہے ایک ترک مصنف ڈاکٹر ہیلی انور کی کتاب کا جس میں تیرھویں صدی (دور سلجوقی) سے لے کر بیسویں صدی تک ترکی نظام طب کی تاریخ درج کی گئی ہے۔ ترجمہ جناب نیر واسطی نے کیا ہے اور مجلس بوعلی سینا لاہور نے اسے شایع کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

خبر و نظر مجموعہ ہے جناب پروفیسر سید علی حیدر صاحب کے چند مذہبی مقالات کا، جن میں مذہبی معتقدات سے نہیں بلکہ بعض شعائر اسلامی (مثلاً روزہ، عید الفطر) کے مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے اخلاقی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے یہ کتاب چونکہ طلبہ کی اصلاح کی غرض سے لکھی ہے اس لئے اس میں ان مباحث سے گریز کیا گیا ہے، جو زیادہ ذی شعور لوگوں ہی کے سامنے پیش کئے جاسکتے ہیں۔

اخیر کے دو مضمون جو اسلامی جمہوریت و اجتماعیت سے تعلق رکھتے ہیں البتہ کسی حد تک وزنی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ملنے کا پتہ:- کتاب منزل سبز باغ پٹنہ۔

مجمع اللغات چھوٹے سائز کا لغت ہے جسے لالہ رام دیال اگروال، کڑہ الہ آباد نے شایع کیا ہے، اس میں عربی فارسی کے قدیم وجدید تقریباً ۵ ہزار الفاظ کا ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے۔ مولوی محمد رفیع دیوبندی اور مولوی محمد فاضل نے اس لغت کو مرتب کیا ہے اور پبلشر نے اسے نہایت اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ اس وقت ایسے لغت کی سخت ضرورت محسوس کی جارہی تھی، اور اردو داں پبلک کو مرتب و ناشر دونوں کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے ایسی مفید کتاب شایع کرکے ملک کی بڑی ضرورت کو پورا کیا

ضخامت ۹۸۴ صفحات - قیمت صرف تین روپیہ۔

نذر خیام عرصہ ہوا راجہ لکھن لال حیدر آبادی نے خیام کی رباعیوں کا منظوم ترجمہ اردو میں کیا تھا لیکن اس وقت تک اس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی تھی۔ اب ڈاکٹر محمد تقی الدین احمد (جامعۂ عثمانیہ) نے اسے شایع کیا ہے اور ایک بسیط مقدمہ لکھ کر اس کتاب کو زیادہ مفید وقیمتی چیز بنا دیا ہے

رباعیات خیام کے متعلق اس وقت کافی مضامین اردو و انگریزی میں شایع ہو چکے ہیں اور فاضل مقالہ نگار نے ان سب کو پیش نظر رکھ کر بڑی جامع بحث اس مسئلہ پر کی ہے۔

ترجمہ میں صرف اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اصل رباعیوں کا مفہوم ہاتھ سے نہ جانے پائے اور بس۔ قیمت ۸ر۔

ملنے کا پتہ :۔ کتاب خانہ عابد روڈ ۔ حیدر آباد دکن ۔

اُردو رسمِ خط رسالہ ہے مولوی محمد امین عباسی (سابق پروفیسر عربی ڈھاکہ یونیورسٹی) کا جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اُردو رسم خط میں جدید اصلاحات سخت نقصان رساں ثابت ہوں گی ۔

اس موضوع پر مختلف حضرات نے مختلف زاویوں سے اظہار خیال کیا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس رسالہ کے فاضل مصنف نے بڑی جامع بحث اس مسئلہ پر کی ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے جو اس مسئلہ سے دلچسپی رکھتا ہے ۔

کتابت طباعت وغیرہ بہت پسندیدہ ہے ۔ قیمت ایک روپیہ ۔ ملنے کا پتہ :۔ ایشیاٹک لٹریری سوسائٹی، لکھنؤ

شاہراہِ وفا مجموعہ ہے چند نظموں کا واقعۂ کربلا کے متعلق ۔ یہ نظمیں جناب وفا ملکپوری کی ارادتمندانہ فکر کا نتیجہ ہیں اس لئے ان کو جذباتی ہونا ہی چاہئے، لیکن زبان و بیان کے لحاظ سے بھی وہ ایسی نہیں کہ ان کے پڑھنے سے لطف حاصل نہ ہو

قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ :۔ کتاب منزل سبزی باغ ۔ پٹنہ

متاعِ کلیم مجموعہ ہے جناب کلیم احمد آبادی کی غزلوں کا جسے کلیم بکڈپو احمد آباد نے حال ہی میں شایع کیا ہے، جناب کلیم احمد آباد کے مشہور خوشگو و خوش فکر شاعر ہیں اور علمی و ادبی حلقوں میں بہت احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ جناب نجیب اشرف ندوی اور جناب اعجاز مدیر شاعر نے اپنے تبصرہ و تعارف میں ان کی شاعرانہ اہلیت کا اعتراف کیا ہے اور یہ اعتراف ایک حد تک نادرست نہیں ہے ۔ قیمت چار روپیہ ۔ ضخامت ۲۷۶ صفحات ۔

شرح دیوان غالب یہ کتاب نتیجہ ہے جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی کاوش کا، جس میں انھوں نے غالب کے اُردو کلام کی شرح کی ہے اور غالباً اس خیال کو سامنے رکھ کر اس سلسلہ میں جتنا کچھ کہا جا سکتا ہے وہ سب کہدیا جائے ۔ کلام غالب کی شرحیں متعدد لکھی گئی ہیں، لیکن شرح و بسط کے لحاظ سے یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔

اس تالیف کا قیمتی حصہ اس کا مقدمہ ہے جو ۲۲۴ صفحات کو محیط ہے اور جس میں غالب کے سوانح کے علاوہ ان کے تمام ذہنی رجحانات اور شاعرانہ خصوصیات پر بڑا بسیط تبصرہ کیا گیا ہے ۔ کتاب بہت اہتمام سے مجلد شایع کی گئی ہے ۔

ضخامت ۹۵۲ صفحات ۔ قیمت آٹھ روپیہ ۔ ملنے کا پتہ :۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس ۔ اسپتال روڈ ۔ انارکلی لاہور ۔

فروغ اُردو حالی نمبر رسالہ فروغ اُردو لکھنؤ کا سالنامہ ۱۹۵۸ء حالی نمبر ہے، جو چھوٹی تقطیع کے ۳۰۷ صفحات کو محیط ہے ۔ اس میں حالی کے سوانح، ان کی تصانیف، ان کی شاعری و نثر نگاری کا ذکر کیا گیا ہے اور کافی جامعیت کے ساتھ ۔۔۔ اس سالنامہ کی ترتیب میں ملک کے مشہور اہل قلم حضرات نے حصہ لیا ہے ۔ قیمت پانچ روپیہ ۔

ولی سے اقبال تک مجموعہ ہے ڈاکٹر سید عبداللہ (پروفیسر اورنٹل کالج لاہور) کے بارہ انتقادی مقالات کا مجموعہ ہے جسے مکتبۂ جدید لاہور نے بہت اہتمام سے شایع کیا ہے ۔

اس مجموعہ میں ولی سے لیکر عہدِ اقبال تک کے اکثر مشہور شعراء کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے اور فاضل نقاد نے ان تمام شاعروں کے کلام کا وسیع مطالعہ کر کے اپنی آزادانہ رائے قایم کرنے میں بڑی سعی بلیغ کی ہے ۔ پہلا مضمون ولی دکنی یا گجراتی پر ہے جسے اُردو شاعری کا ابوالآبا کہا جاتا ہے ۔ ولی پر اس وقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے بالکل نئے زاویہ سے اس کا مطالعہ کیا ہے اور ان کا یہ خیال کہ ولی کا خاص فن محض ایک خاص قسم کی طربیہ حسن پرستی تھی، بالکل درست ہے ۔ وہ یقیناً محبت کے باب میں میر کے ضد واقع ہوئے تھے انھوں نے حسن کا مطالعہ زیادہ تر آنکھوں سے کیا اور میر نے دل سے ۔ میر اعتراف حسن آہ سے کرتے تھے اور ولی واہ سے ۔ اسی لئے ولی کے یہاں سوز و درد کم لیکن رنگینی و نغمہ آفرینی زیادہ پائی جاتی ہے ۔

دوسرے مضمون میں اُردو مثنوی کے دکنی دور کا جایزہ لیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں فاضل نقاد نے دکن کی تمام مثنویوں کو سامنے رکھکر

ان کی موضوعی تقسیم کی ہے اور سراج کی مثنوی بوستانِ خیال کو بہترین عشقیہ مثنوی قرار دیا ہے۔

تیسرے مضمون کا عنوان ہے " کلام میر میں فکر و نظر کا عنصر"۔ میر کی غم آگیں و غم آفریں شاعری کے سلسلہ میں بہت کم اس پر غور کیا گیا تھا کہ ان کے متشائم نقطۂ نظر کا مرکزی تصور کیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس پہلو کو لیکر بتایا ہے کہ میر کا مطالعۂ کائنات کس انداز کا تھا اور اور ان کے تاثرات اس باب میں کس حد تک وجدانی اور کس حد تک مفکرانہ تھے۔ میر کے باب میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ در اصل الم نصیبی اور الم آفرینی کے فرق و امتیاز سے تعلق رکھتا ہے، جس میں فطری رجحانات اور اکتسابی میلانات سبھی کچھ شامل ہوتا ہے۔ اور فاضل نقاد کا ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اس نتیجہ تک پہونچنا بالکل درست ہے کہ " میر کی فکر و نظر کے انداز گویا جنون و شعور کے ملے جلے انعکاسات ہیں"۔

تیسرا مضمون میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" پر ہے جس میں اس کی تکنک اور نفسیاتی تجزیہ کو سراہا گیا ہے۔ اس کے بعد مثنوی "گلزار نسیم" پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد کہ "یہ داستان لکھ کر صرف اپنے پر تکلف طرز بیان کا کمال دکھایا گیا ہے"۔ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ مثنویت سے قطع نظر اس کے "پر تکلف طرز بیان" کی بے تکلفی بھی اپنی جگہ ایک خاص لطف رکھتی ہے اور اگر اس کے ساتھ اس کے ایجاز کو بھی سامنے رکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ صنف مثنوی نگاری میں گلزار نسیم کی حیثیت اگر تختۂ گل کی سی نہیں تو ایک "دستۂ گل" کی سی یقیناً ہے۔

چھٹا مضمون خواجہ آتش پر ہے۔ بہت زمانہ ہوا جب آتش کے متعلق میں نے ظاہر کیا تھا کہ اس کو صوفی کہنا یا اس کے کلام کو متصوفانہ کہنا غلط ہے اور اس پر بعض حضرات بدمزہ بھی ہوئے تھے۔ اس لئے مجھے بڑا اطمینان ہوا یہ دیکھ کر کہ اس باب میں ڈاکٹر صاحب بھی میرے ہم خیال ہیں۔ محض چند مفروضات و اصطلاحات تصوف کے استعمال کا نام صوفیانہ شاعری نہیں، بلکہ اس کا تعلق محض وجدان سے ہے، جو آتش میں یقیناً مفقود تھا۔ آتش ایک رند مشرب، آزاد طبیعت، قلندرانہ فطرت رکھنے والا انسان تھا اور اس کی یہی خصوصیات اس کی شاعری کی جان ہیں، جن کو ڈاکٹر صاحب نے کافی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس کے بعد ساتواں مضمون مصحفی کی شاعری پر ہے، مصحفی کے ساتھ مصنف آبحیات نے جو بے انصافی کی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اہل فکر بھی اسی رو میں بہ گئے اور مصحفی کو وہ حق نہ دلا سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس حق تلفی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ مصحفی نہ صرف یہ کہ وہ بڑا متنوع الخیال شاعر تھا بلکہ عہد آفریں شاعر بھی تھا، جس نے غزل کو نیا اسلوب، نئی وسعت اور رنگینی عطا کی۔ نگار کے مصحفی نمبر میں، میں نے بھی یہی لکھا تھا۔ اور مجھے بڑی خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ ڈاکٹر صاحب بھی اس باب میں میرے ہمنوا ہیں۔

آٹھواں مضمون ناسخ پر ہے اور اس سلسلہ میں کتنی معقول بات کہی ہے ڈاکٹر صاحب نے کہ:- "ناسخ ساری عمر زبان کو سنوارتے رہے اور شاعری کو بگاڑتے رہے"۔ یہ مختصر سا فقرہ ایک بڑی وسیع تنقید اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایک جگہ اور وہ یہ لکھتے ہیں کہ:-

> "ناسخ کا المیہ یہ نہیں کہ وہ زبان کی تہذیب و تنقیح میں منہمک رہکر محض علمی مشغلہ کے آدمی بن کر رہ گئے، بلکہ ان کا حادثہ وہ سیاسی زندگی بھی ہے جس میں ان کے کردار کو خلوص ضمیر کی قربانی دینی پڑی اور وہ شاعری سے زیادہ شاطری کرتے رہے۔
>
> جہاں تک ان کی فطری قابلیتوں کا تعلق ہے، اگر زمانہ مختلف ہوتا تو وہ لکھنؤ کے دوسرے سودا بن سکتے تھے، مگر لکھنؤ کی معاشرت میں اہل کا احساساتی پیوند لگنا قدرے مشکل تھا ـــــ وہ ناسخ تھے اور ناسخ ہی رہے۔ اور یوں رفتہ رفتہ منسوخ ہو کر رہ گئے"۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعروں میں تو نہیں لیکن "متشاعروں" میں وہ بڑا "متشاعر" انسان تھا۔

اس کے بعد دو مضمون غالب پر نظر آتے ہیں، ایک غالب کی غزل پر جو بہت مختصر ہے لیکن نہایت پُر مغز۔ دوسرا مضمون جس میں غالب کے "حاسۂ انتقاد" پر روشنی ڈالی ہے، نئی چیز ہے۔ غالب کے اس ادبی پہلو کو اکثر حضرات نے نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ مضمون غالب

کی خودی کی داستان ہے جو لطف و افادہ دونوں پر مشتمل ہے۔

گیارھواں مضمون داغ کے "شہر آشوب دہلی سے متعلق ہے، اور خوب ہے۔

آخری مضمون اقبال کے سیاسی تفکر سے تعلق رکھتا ہے۔ اقبال کے سیاسی افکار میں باہمد گر تضاد پایا جاتا ہے اور اگر ان سب کو سامنے رکھا جائے تو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اقبال کا واقعی پیغام کیا تھا اور وہ خود بھی کسی بات پر مطمئن تھے یا نہیں۔ ان کے یہاں ملوکیت، مذہبی آمریت، جمہوریت، اشتراکیت، قومیت و وطنیت سبھی نظریوں کا ذکر ملتا ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں جستجوئے راہ کی سی تھیں تعیین منزل کی نہ تھیں۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے اقبال کی اسی ذہنیت پر اظہار خیال کیا ہے اور کافی حق و صداقت کے ساتھ۔

ڈاکٹر صاحب اس عہد کے بہترین نقادوں میں سے ہیں اور اس لحاظ سے کہ دوسرے نقادوں کی طرح وہ مغربی انداز فکر و گفتگو سے کام نہیں لیتے، وہ اپنے عہد کے منفرد صاحب فکر نقاد ہیں۔ یہ کتاب پانچ روپیہ میں مکتبۂ جدید لاہور سے مل سکتی ہے۔

شہر آرزو جسے "ماتم یک شہر آرزو" کہنا چاہئے۔ مجموعۂ کلام ہے باقر مہدی کا جس میں چند رباعیاں اور غزلیں ہیں اور کچھ نظمیں۔ باقر مہدی، ترقی پسند شاعر ہیں۔ لیکن اپنی افتاد مزاج کے لحاظ سے بہت عزلت پسند۔ وہ زمانہ کے مقابلہ میں ہنگامہ آرائی کو پسند نہیں کرتے بلکہ ذاتی جذبۂ ایثار سے کام لیتے ہیں، اور اسی طبعی خصوصیت نے ان کی شاعری میں "عظمتِ غم" کی ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے جس کو اگر "خود سوزی" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

باقر مہدی کے کلام میں خواہ وہ غزل ہو یا نظم ہر جگہ یہی کیفیت محسوس ہوتی ہے اور بے اختیار ان سے ہمدردی کرنے کو جی چاہتا ہے گو وہ خود اس کے طالب نہیں۔ کچھ یہی رنگ فیض کا بھی ہے، لیکن اس قدر تلخ و صبر آزما نہیں۔

باقر مہدی فطرتاً غزل گو پیدا ہوئے ہیں اور اسی لئے ان کی نظمیں بھی تغزل اور تاثرات و جذبات کی صداقت سے خالی نہیں۔ جس چوٹ کو لیکر وہ لکھنؤ سے بمبئی گئے تھے، وہ وہاں بھی برابر اپنا کام کر رہی ہے اور ایک سچے شاعر کی تخلیق میں مصروف کار ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

جانے کیوں ان سے ملتے رہتے ہیں — خوش وہ کیا ہوں گے جب خفا ہی نہیں

چلے تو جاتے ہو روٹھے ہوئے مگر سن لو — ہر ایک موڑ پر کوئی تمھیں صدا دے گا

وہ جا چکے، ملیں گے نہ اب عمر بھر مجھے — اے دل کسی کو پھر سے منانے کے دن گئے

زمانہ گزرے گا، ٹوٹیں گے سیکڑوں رشتے — پھر ایک شخص فسانہ مرا سنائے گا

بھلا چکا ہوں تجھے آج اور یہ عالم ہے — کہ سوچتا ہوں مجھے تیرا انتظار نہیں،

گزر رہا ہوں غموں کے نئے مراحل سے — یہ وہ سفر ہے جہاں کوئی رہگزار نہیں

دردِ دل آج بھی ہے جوشِ وفا آج بھی ہے — زخم کھانے کا محبت میں مزا آج بھی ہے

بے خودی وجہ سکونِ دلِ ناداں نہ ہوئی — خود کو رسوا سرِ بازار کروں یا نہ کروں

ہزار راہ میں دشوار منزلیں آئیں — قدم قدم پہ سنبھلتی ہوئی حیات چلی

قافلے خود سنبھل سنبھل کے بڑھے — جب کوئی میر کارواں نہ رہا،

سنایا کرتے تھے دل کو حکایتِ دوراں — مگر جو دل نے کہا ہم سے وہ سنا نہ گیا

بہار آئے گی لیکن ہماری دنیا میں — خزاں بدوش ابھی لالہ زار ہیں کتنے

کچے دھاگے ٹوٹ چکے ہیں، کتنے ساتھی چھوٹ چکے ہیں — جانے کیوں دل اب تک تم کو اپنا سہارا جانے ہے

قیمت ساڑھے تین روپیہ - ملنے کا پتہ:- گوشۂ ادب - ۲۱ - ارکیڈیا بلڈنگ - بمبئی (۸)

فلاسفۂ قدیم اس مجموعہ میں حضرت نیازؔ کے دو علمی مضامین شامل ہیں۔ (۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) مادیں کا مذہب نہایت دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

انتقادیات حضرت نیازؔ کے انتقادی مقالات کا مجموعہ، فہرست مضامین یہ ہے۔ ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اُردو غزل گوئی پر عہد بہ عہد ترقی، نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون ایڈیٹر۔ حقیقت نگاری۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

مذہب حضرت نیازؔ کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول)

مذاکرات نیاز یعنی نیازؔ کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس رسالہ کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید اڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

فراست الید اس کے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال، موت و حیات، معیاری شہرت پر پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

مالہ وماعلیہ حضرت نیازؔ نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فن شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں اور اس کا ثبوت اکھنو ، دور حاضر کے بعض اکابر، شعرا مثلاً جوشؔ، جگرؔ، سیمابؔ وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے، ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

نقاب اُٹھ جانے کے بعد نیازؔ فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت اور علمائے کرام کی زندگی کیا ہے اور اُن کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ، انشا کے لحاظ سے جو رتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت آٹھ آنے (علاوہ محصول ڈاک)

مجموعۂ استفسارات ۔ تاریخی، علمی، ادبی معلومات کا ایک قیمتی مجموعہ۔ قیمت تین روپے (علاوہ محصول)

نقشہائے رنگا رنگ۔ غالب کی فارسی غزل گوئی اور اس کی خصوصیات پر نیازؔ فتحپوری کا ایک مقالہ۔ قیمت بارہ آنہ (علاوہ محصول ڈاک)

گلہائے جعفری۔ جناب آغا لکھنوی لکھنوی کے سو انتخاب اشعار مع مقدمۂ از نیازؔ فتحپوری۔ قیمت آٹھ آنے (علاوہ محصول ڈاک)

دیگر مُصنّفین کی کتابیں

قول فیصل۔ جناب اختر حیدرآبادی کی ایک طویل مرصع نظم جس میں وجود باری پر مثیل انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

فلسفۂ مذہب۔ سید مقبول احمد کی مشہور مجتہدانہ تصنیف جس میں عقائد اسلام پر فاضلانہ بحث و تنقید کی گئی ہے۔ قیمت تین روپے (علاوہ محصول)

عورت و اسلام۔ جناب مالک رام ایم، اے کی مشہور تصنیف جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے عورت کا درجہ کس قدر بلند کر دیا ہے۔ قیمت تین روپے (علاوہ محصول ڈاک)

مرثیہ نگاری و میر انیس۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا بے لاگ تبصرہ انیس کے فن مرثیہ نگاری پر قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ (علاوہ محصول ڈاک)

ملک خطا کے شہزادے۔ سید وصی احمد بلگرامی کا ایک شاہکار جس میں ایک خاص طنزیہ انداز سے شبلی وغیرہ کے بعض مذہبی نظریوں پر تنقید کی گئی ہے۔ قیمت بارہ آنہ (علاوہ محصول ڈاک)

مینجر نگار لکھنؤ

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۲۸ء (مومن نمبر) مومن نمبر ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مومن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا اشد ضروری ہے۔ قیمت پانچ روپیہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری سنہ ۱۹۴۸ء (پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تدوین اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دو زریں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

جنوری فروری سنہ ۱۹۴۹ء (افسانہ نمبر) نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کیے ہیں، اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر اصول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

جنوری فروری سنہ ۱۹۵۱ء (مشرق وسطیٰ نمبر) اس سالنامے کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ایران مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاست اور ان کی موجودہ اقتصادی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

سالنامہ ریاض نمبر حضرت ریاض خیرآبادی کی شاعری اور ادبی خصوصیات کا تفصیلی جائزہ۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

سالنامہ سنہ ۱۹۵۲ء (حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ سنہ ۱۹۵۴ء (فرمانروایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے۔ جس میں ولادت نبوی سے لے کر اس وقت کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل تاریخی کتاب ہے جو ہر پڑھے لکھے کے پاس ہونا چاہیئے۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ سنہ ۱۹۵۵ء (علوم اسلامی نمبر) (علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) مع تتمہ جس میں اسلامی علوم و فنون پر تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا کیا حصہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دیکر ان کی علمی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ سنہ ۱۹۵۶ء (خدا نمبر) خدا کا تصور عہد تاریک سے تک، ہمیشل تاریخ تبصرہ مذاہب عالم پر۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ سنہ ۱۹۵۷ء (اصناف سخن نمبر) غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ رباعی۔ مرثیہ وغیرہ جملہ اصناف سخن پر ایک بیش بہا ذخیرۂ معلومات۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ سنہ ۱۹۵۸ء (معلومات نمبر) یہ سالنامہ مجموعہ ہے بہت سی ایسی تاریخی، علمی، ادبی اور مذہبی معلومات کا جن کا علم ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ گویا یہ ایک نوع کی سائیکلوپیڈیا ہے۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ سنہ ۱۹۵۹ء (تنقیح اسلام نمبر) اسلام و تعلیمات اسلام کا صحیح مطالعہ، روایتی اصول سے ہٹ کر خالص عقلی و اخلاقی نقطۂ نظر سے۔ قیمت چار روپے۔ (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

(باقی صفحہ ۳ پر ملاحظہ فرمائیے)